خیال کے متعلق جو اعتراضات کئے جاتے ہین، ان کے وجدانی مگر نہایت صحیح جوابات دیئے ہین، امیر درصاحب نے غالب، سرسید، حالی، شبلی، اکبر، امام ہندی، مولانا محمد علی، اقبال، اور نیاز فتحپوری کے خطوط کی مضامین سے ان کی زندگی کا عکس دکھایا ہے، ناقد مبصر نے ان خطوط کے متعلق نہایت صحیح رائے ظاہر کی ہے، جس مین کسی ترمیم کی گنجایش نہین، مضمون گو مختصر ہے لیکن مضمون نگار کی جدت اور نکتہ سنجی کا نمونہ ہے، عبدالسلام صاحب کا مضمون گو بہت عالمانہ ہے لیکن خشک اور دقیق ہے، اور اس سے مخصوص اشخاص ہی لطف اٹھا سکتے ہین، باقی مضامین بھی فائدہ سے خالی نہین،

لاجونتی از سر آنند سروپ بھٹناگر، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۱۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، مجلد قیمت معلوم نہین، پتہ:۔ مصنف نمبر ۲۵، تغلق رود طفنی دہلی سے ملے گی،

مذکورہ بالا کتاب ڈاکٹر سر آنند سروپ بھٹناگر کے اردو کلام کا مجموعہ ہے، مصنف ہندوستان کے ان مایۂ ناز علمائے طبیعیات مین ہین جن کی تحقیقات و انکشافات اس فن مین یورپ کے بڑے بڑے علماء سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہین، لیکن یہ نہ معلوم تھا کہ وہ ایک قادر الکلام اور نکتہ سنج شاعر بھی ہین، طبیعیات کے خشک مسائل اور شاعری کی رنگین خیالی دنیا مین ایک طرح کا بیر ہے لیکن مصنف نے حقیقت اور مجاز دونون کو ملا دیا، پھر ان کی شاعری محض قافیہ پیمائی اور گل و بلبل کا افسانہ نہین بلکہ ظاہری حیثیت سے حسن بیان کی تمام لطافتون سے آراستہ اور معنوی حیثیت سے حکیمانہ خیالات پر مشتمل ہے، چنانچہ اس مجموعہ مین مختلف قلبی واردات، اخلاقی و حکیمانہ خیالات اور مختلف قومی و وطنی جذبات پر پاکیزہ نظمین ہین لیکن خشک سے خشک موضوع مین بھی لطف بیان کا دامن ہاتھ سے نہین چھوٹا ہے، مصنف کی دوسری قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ وہ غالب کے شاگرد رشید منشی ہر گوپال تفتہ کے نواسے ہین جنھین مرزا نے محبت سے مرزا تفتہ لقب دیا تھا، مکاتیب مین ان کے نام بہت سے خطوط ہین جن سے ان کے ساتھ غالب کی محبت کا اندازہ ہوتا ہے، اس لئے شاعری گویا سر آنند سروپ کی موروثی دولت ہے اس لئے یہ مجموعہ ہر حیثیت سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

"م"

جلد ۵۸ ماہ محرم الحرام ۱۳۶۶ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۴۶ء عدد ۶

مضامین

مقالات

استفسار و جواب

ضروری تصحیح ص ۴۷۲ سطر اٹھارہ میں "سنہ ۱۱۵۶ھ غلط ہے" کے بعد یہ عبارت چھوٹ گئی ہے "اصل عربی عبارت میں صفر سنہ ۵..ھ ہے اور یہی صحیح ہے"۔

شذرات

ناظرین معارف کو نہایت رنج و اندوہ کے ساتھ یہ اطلاع دیجاتی ہے کہ ہمارے ایک دیرینہ رفیق کار دار المصنفین کے پرانے اور اہم کارکن منشی محمد ادریس صاحب وارثی بتیس سال کی رفاقت کے بعد ہم سے جدا ہوگئے، مرحوم نے ۱۰ ذی الحجہ کو ایک مختصر علالت کے بعد انتقال کیا، وہ دار المصنفین کے قیام کے آغاز سے اس سے وابستہ تھے، اور آخر دم تک بڑی جانفشانی، اخلاص، خیر خواہی اور دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے، اور ہمیشہ اس کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر انجام دیا، مکتبہ دار المصنفین کی ترقی مین اُن کی محنت کو بڑا دخل تھا، اس کے تجارتی کاروبار مین اُن کی ذات بڑا سہارا تھی، اور دفتری کامون کا دارومدار اُنہی پر تھا، اب اُن کا جانشین ملنا مشکل ہے، ان خوبیون کے ساتھ مرحوم شرافت اور وضعداری کا نمونہ تھے، نہایت خوش خلق، شریف الطبع، حق گو، حق پرست، مرنجامرنج، اعزہ کے مددگار، احباب کے ہمدرد و غم گسار، اُن کا برتاؤ ایسا تھا کہ ہر شخص اُن کو اپنا سمجھتا تھا، سب کے دل مین اُن کی یکسان عزت و وقعت تھی، بتیس سالہ زندگی مین کسی کو اُن سے کوئی شکایت پیدا نہین ہوئی، وہ دنیاوی معیار سے کوئی اونچی شخصیت کے مالک نہ تھے، نہ صاحب جاہ و ثروت تھے، نہ کوئی علمی حیثیت رکھتے تھے، لیکن اگر بڑائی نام ہے اخلاق و شرافت اور سیرت و کردار کی بلندی کا تو مرحوم بہت بڑے آدمی تھے اللّٰھم اغفرلہ مغفرۃ واسعۃ ناظرین معارف سے بھی مرحوم کے لئے دعاے مغفرت کی درخواست ہے،

راقم الحروف نومبر کے پہلے ہفتہ مین ایک لمبے سفر مین جانے والا تھا، اور ادھر سے بقرعید کی تعطیل ہو رہی تھی، اس لئے اس سے پہلے معارف کا کام ختم کردینا ضروری تھا، گو بہار کا فساد اس وقت شروع ہو چکا تھا، لیکن اُس نے ایسی سنگین شکل اختیار نہ کی تھی، اس لئے اُس وقت کے حالات کے مطابق شذرات مین خیالات ظاہر کئے گئے تھے، لیکن بہار اور گڈھ مکتیسر کے واقعات نے ایک نئی صورت حال پیدا کردی ہے، جو اس سے پہلے خیال مین بھی نہ آسکتی تھی، ان دونون مقامون مین مسلمانون پر جو سفاکانہ مظالم ہوئے، اور ضعیف و ناتوان بوڑھون

مجبور و بیکس عورتون اور شیر خوارون کا جس بے دردی سے قتل عام کیا گیا اور مسلمانون کی بستیان جس طرح خاک مین ملائی گئین، اس کی مثال وحشی درندون کے سوا انسانون مین نہین مل سکتی، اور یہ قتل و غارتگری جس تیاری وسعت اور تنظیم کے ساتھ ہوئی، اس کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے، کہ بہار کے مسلمانون کو بالکل پست و پامال کرکے بزور اُن سے اپنی قوت کا لوہا منوایا جائے، اور معتبر اور مستند اطلاعات کی بنا پر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس قتل عام مین بہار کی نیشنلسٹ جماعت اور کانگریس کے مقامی لیڈرون کا بھی ہاتھ شامل تھا اور حکام نے بھی غفلت سے کام لیا، حکومت کے نشۂ اقتدار کے سوا اس کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے، اگر آزاد قومی حکومت کا نمونہ یہی ہے، تو اس سے مسلمانون کی بدگمانی کیا بیجا ہے،

کانگریس کی آئینی و دستوری حیثیت سے بحث نہین، لیکن چند مستثنیٰ افراد کو چھوڑ کر اس پر جس قسم کی ذہنیت کی جماعت کا غلبہ ہے، اس کا اندازہ ان اشتعال انگیز تقریرون سے ہوسکتا ہے، جو کانگریس پلیٹ فارم سے مسلمانون کے خلاف ہوئین، اور جن مین علانیہ ہندؤن کو ان کے خلاف اُبھارا گیا، بہار کے واقعات نے اس ذہنیت کو اور زیادہ بے نقاب کر دیا ہے، اس پر طرہ یہ ہے کہ اس کے بجائے کہ کم از کم کانگریسی لیڈرون کی جانب سے ان وحشیانہ واقعات پر متفقہ ملامت اور اس سے اظہار بیزاری کیا جاتا، الٹے ان کی اہمیت کو گھٹانے اور اُن کی پردہ پوشی کی کوشش کی جارہی ہے، اس کے بعد کانگریس کا مشترکہ نمایندگی کا دعوی کہان تک صحیح تسلیم کیا جاسکتا ہے؟

اگر کانگریسی لیڈرون کی یہی ذہنیت قائم رہی، اور کانگریس نے اپنی ذمہ داری کا احساس اور آیندہ کے لئے اس قسم کے واقعات کا پورا انسداد نہ کیا تو اس کا لازمی نتیجہ، اس کا خاتمہ، انگریزون کی دائمی غلامی یا قیام پاکستان ہے، اس لئے کہ مسلمانون سے اتحاد اور اُن کی مدد کے بغیر آزادی کا تصور ایک خیال خام ہے، اور اگر لیگ کے مجوزہ پاکستان کی مخالفت بھی کی جائے تو بھی ان حالات مین جہان جہان مسلمان اقلیت مین ہین، اور اپنی حفاظت نہین کرسکتے وہان سے وہ دوسرے مقامون پر منتقل ہونے کے لئے مجبور ہونگے جیسا کہ بہار مین شروع ہوگیا ہے، اس طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ مین پاکستان قائم ہوجائین گے،

بہار کے واقعات، ایسے دردناک ہین کہ ان سے ان نیشنلسٹ مسلمانون کے دلون پر بھی چوٹ لگی جو

صرف وطن کے بت اور آزادی کی دیوی کے پجاری نہیں ہیں، بلکہ اپنی قوم کا بھی درد رکھتے ہیں، اور اس کی عزت و وقار کے لئے وہ آزادی کے طلبگار ہیں، چنانچہ بعض نے علانیہ اور بعض نے بلیغ پیرایہ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور کانگریسی لیڈروں کو دلوں کی کھوٹ اور ان کے اصلی منصب کی جانب توجہ دلائی،

کاش بہار کے واقعات سے مسلمان یہ سبق حاصل کرتے کہ وہ اپنی اندرونی تنظیم اور قوت مدافعت پیدا کئے بغیر باعزت زندگی بسر نہیں کر سکتے، ورنہ سیاسی حقوق تو الگ رہے ان کا جینا بھی دشوار ہو جائے گا، بے جان جسم تاج شاہی بھی نہیں سنبھال سکتا، اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ تمام اسلامی جماعتیں سیاسی اختلافات سے قطع نظر کر کے مسلمانوں کی تنظیم کے مسئلہ میں متحد ہو کر عملی کام شروع کر دیں، سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ ہے اس لئے اس پر یہ فرض سب سے زیادہ عائد ہوتا ہے ورنہ محض سیاسی رزم آرائی اور تیغ زبان کی تابانی مسلمانوں کو نہیں بچا سکتی جب تک بازوؤں میں حفاظت کی قوت نہ ہو،

جامعہ ملیہ کی جوبلی میں مہینوں سے شرکت کا مصمم ارادہ تھا، اور سفر کی پوری تیاری ہو چکی تھی، کہ عین موقع پر ایسے موانع پیش آ گئے، کہ رخت سفر باندھکر کھول دینا پڑا، جوبلی ایسے ناموافق حالات میں ہوئی جب کے ہندوستان کے مختلف حصوں میں فتنہ و فساد کی آگ مشتعل تھی، اور لوگوں کا اپنی جگہوں سے نکلنا مشکل تھا، لیکن اخبارات کی اطلاعات اور جوبلی میں شرکت ہونے والے احباب کی زبانی معلوم ہوا کہ ان موانع کے باوجود جوبلی ہر حیثیت سے کامیاب رہی، اس کے اجتماع میں بہت کم فرق آیا، اور ہندوستان کے اکثر اکابر اور مختلف طبقوں اور جماعتوں، اور ہر مسلک و خیال کے اشخاص نے جوبلی میں شرکت کی، اور جامعہ نے متضاد عناصر کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا، جو اس کی مقبولیت کی دلیل ہے، ہم محترم شیخ الجامعہ اور کارکنان جامعہ کی خدمت میں اس کامیابی پر مبارک باد پیش کرتے ہیں،

جامعہ مسلمان نوجوان کا پہلا سنجیدہ اور ٹھوس کارنامہ ہے، اس کی کامیابی کا راز اس کے کارکنوں کا اخلاص اور ایثار تھا، اشتراک عمل : ور ان سب سے بڑھکر شیخ الجامعہ کی شخصیت جامعہ ہے جن کی کوشش سے جامعہ کا نظام شمسی قائم ہے، جامعہ اپنی عمر کی کٹھن منزلیں طے کر چکی، اب اس کے سکون اور اطمینان کا دور آئیگا، لیکن یہی سب سے زیادہ نازک دور ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اس کے خطرات سے محفوظ رکھے اور جامعہ ملیہ کو ملک و ملت کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور ان میں مقبول بنائے،

مقالات

خطبۂ اسناد طبیہ اسکول پٹنہ ۱۹۴۴ء

ھُوَ الشَّافی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دو تین برس ہوئے کہ طبیہ اسکول پٹنہ نے مجھے، اپنے جلسہ تقسیم اسناد کا خطیب منتخب کیا تھا، مگر افسوس کہ میں اپنی علالت کے سبب سے شریک جلسہ نہ ہو سکا، آئندہ سال پھر یہ موقع آیا اور پھر میں نہ جا سکا اور یہ خطبہ یوں ہی پڑا رہا، اب چونکہ میرے حالات کے لحاظ سے آئندہ اور بھی وقت ان کاموں کے لئے نہ مل سکے گا، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دفینہ کو وقف عام کر دیا جائے،

"سید سلیمان ندوی"

طب سے میرا خاندانی تعلق حضرات! آپ نے دعوت دی، میں نے قبول کی، اس آسانی قبول کی وجہ ایک تو وطن کا رشتہ تھا، دوسرا یہ خیال کہ شاید اس ذریعہ سے کچھ مفید باتیں کانوں میں پہنچ جائیں، تاہم اس مناسبت کے وجوہ پر غور کرتا رہا کہ طبیبوں کے بھرے مجمع میں ایک غیر طبیب کو دعوت کیوں دی گئی، آپ کے سابق خطیب استاد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی طرح تو نہیں کہہ سکتا کہ ڈاکٹر کی شہرت نے طبیبوں میں شامل کر دیا، کیونکہ مجھے "ڈاکٹر" بنے ابھی ایک ہی سال ہوا ہے، اور اس نے نام کے جزو کی حیثیت حاصل

نہیں کی ہے، تاہم اس دعوت میں ایک ایسی مناسبت ہے جس کا استحقاق گو ذاتی طور سے مجھے حاصل نہیں،
لیکن موروثی استحقاق حاصل ہے، یعنی میرا تعلق اس صوبہ کے اُس خاندان سے ہے جس نے ایک صدی سے
زیادہ اس فن شریف کی خدمت کی ہے، میری نانہال میں غالبًا اخیر شاہی زمانہ سے یہ فن باقی ہے، اور میرے
دادیہال میں سنہ ۱۲۵ھ سے جو میرے جد امجد کی تحصیل طب کا زمانہ ہے سنہ ۱۲۹۶ھ تک جو میرے بڑے بھائی
مرحوم کی وفات کا زمانہ ہے سو برس تک اس فن کی خدمت ہوئی، میرے والد ماجد کے ماموں نے عذر سے
پہلے دہلی واگرہ کے اطبا سے تحصیل کی اور نواب امیر علی خاں باڑھ کے توسط سے واجد علی شاہ کے ساتھ
کچھ دن گذارے اور پھر بہار میں بیٹھ کر آج سے سو برس پہلے مطب کیا، اور فقیرانہ صورت میں امرا اور رؤسا میں
قبولیت حاصل کی، میرے نانا مرحوم نے غالبًا فیض آباد جا کر طب پڑھی، دادا مرحوم نے طب کی تعلیم اسی عظیم آباد
پٹنہ میں قاضی القضاۃ قاضی محمد وحید الدین خاں کے یہاں رہ کر حکیم خواجہ عبید اللہ شاہجہان آبادی اور
حکیم اکلم مرحوم عظیم آبادی سے سنہ ۱۲۴۷ھ سے سنہ ۱۲۵۶ھ تک حاصل کی اور پہلے بہار میں شاہ اظہر حسین صاحب
کے مکان پر سنہ ۱۲۵۲ھ میں مطب کھولا اور پھر شیخپورہ جا کر سنہ ۱۲۵۸ھ میں نوابان حسین آباد و رؤسائے شیخپورہ
کے اصرار سے مطب قائم کیا، اور جہاں انھوں نے سنہ ۱۳۰۳ھ تک جو انکی وفات کی تاریخ ہے اُن اطراف میں فن
طب میں وہ ناموری حاصل کی کہ اب تک اس دیار میں اُن کا نام روشن ہے، "کیا ہوا ثانی بقراط و ارسطاطالیس"
ان کی تاریخ وفات ہے، جو نواب محمد علی خاں صاحب حسین آباد کی یادگار ہے،

والد مرحوم نے طب کا آغاز اپنے والد ماجد سے سنہ ۱۲۷۶ھ میں کیا اور کامل ہو کر رؤسائے اسلام پور و نہر کی
قدر دانی سے سنہ ۱۳۴۳ھ تک اس فن کی خدمت میں مصروف رہے، بڑے بھائی صاحب نے اسی پٹنہ میں حکیم نصیر الحق صاحب
سے طب پڑھی اور مرتے دم تک یعنی سنہ ۱۳۳۶ھ تک اسی کام میں لگے رہے، میرے چچیرے چچا حکیم لیاقت حسین صاحب مرحوم حکیم ابراہیم
صاحب جھوائی ٹولہ لکھنؤ کے شاگرد تھے، جو موجودہ حکیم عبد المعید صاحب لکھنوی کے دادا تھے،

میرے دادا کے نانا حکیم سید خادم حسین صاحب بھی نامور طبیب تھے، دادا صاحب لکھتے ہیں،

جد امجد طبیب حاذق بود | میر خادم حسین فائق بود
بے شک و شبہہ آں طبیب زمن | عالم طب و ماہر ہمہ فن

ان کے صاحبزادے حکیم کاظم حسین بھی طبیب تھے، اور واجد علی شاہ کے مٹیا برج میں جا کر اکتساب
فیض کیا تھا، میرے بڑے پھوپھا حکیم نور الحسن نے پٹنہ میں تحصیل کی اور اسھاواں میں پچاس ساٹھ برس تک مطب
گرم رکھا، اور ایسی حذاقت دکھائی کہ ان اطراف کے لوگ آج بھی شاہد ہیں، ان بزرگوں کے قلمی اور مطبوعہ
متروکات اور سفینے اب تک موجود ہیں، اور ان کی اس امانت کی حفاظت کی سعادت اس ناچیز کو حاصل
ہے، یہ تفصیل اس موقع پر گو بے محل ہو، لیکن اس لئے کی گئی تا کہ ایک نا اہل کی ذاتی نا اہلیت پر بزرگوں کی
اہلیت سے پردہ پڑ جائے،

گرچہ خرد یم نسبتے ست بزرگ

ایک گاؤں سے صوبہ کا قیاس اس ذکر کا دوسرا سبب یہ ہے کہ جب بہار کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں طبی
چہل پہل اور رونق کا یہ عالم تھا تو پورے صوبہ نے اس کی جو خدمت کی ہوگی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

طب کا آغاز طِبٌّ عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے اصلی معنی جھاڑ پھونک اور سحر و جادو کے ہیں، عربی
شاعر کہتا ہے، ولا، نا مطبوبٌ بمکحولتی عینیھا، یعنی میں محبوب کی سرگیں آنکھوں کے جادو میں نہیں مبتلا
ہوں، گویا مطبوب مسحور کے معنی میں ہے، یہ لفظ بتاتا ہے کہ اس فن کا آغاز ابتدائی قوموں میں جھاڑ پھونک،
ٹوٹکے اور جادو منتر سے ہوا، آخر زمانہ کی رفتار کے ساتھ تجارب اور قیاسات نے اوہام و تخیلات کی جگہ
لے لی، یہاں تک کہ آج یہ سرتاپا تجربیات اور دلائل عقلی و طبعی پر مبنی ہے، عربوں میں بھی یہ فن اسی طرح
شروع ہوا اور بڑھا، عرب کا پہلا تجربی طبیب حارث بن کلدہ سمجھا جاتا ہے جو اسلام کے آغاز میں
تھا، اسلام نے اپنے ظہور کے ساتھ طب روحانی کے ساتھ طب جسمانی کا مطب بھی قائم کر دیا، محدثین
نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں جو کچھ پایا اس کو طب نبوی کے نام سے الگ جمع کر دیا ہے

چنانچہ ساتویں صدی میں حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں اس کا ایک مستقل طویل باب باندھا ہے،

طبی تراجم مسلمانوں میں غیر قوموں کے طبی تجربوں سے استفادہ کا آغاز دولت بنو امیہ کے آغاز سے ہوا جس کا دار الحکومت دمشق تھا، اور جہاں یہودی و عیسائی طبیب موجود تھے، جو یونانیوں کے خوشہ چین تھے، سب سے پہلے حکیم ابن آثال نے امیر معاویہؓ کے زمانہ میں یونانی طبی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا، مروان کے زمانہ میں ماسرجویہ یہودی نے یونانی طبیب القس ہرون کے کناش (سفینہ) کا ترجمہ عربی میں کیا اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے پہلی صدی کے خاتمہ پر اس سفینہ کو پبلک کے فائدہ کیلئے عام کیا، سب سے پہلا شفا خانہ عبدالملک نے اپنے زمانہ میں قائم کیا، عباسی خلفاء نے اپنے دور میں اس فن کی ترقی کا شاندار دور پیدا کیا، ایک طرف ہندوستان کے وید اور دوسری طرف یہودی و عیسائی اطبا کو جو سریانی و یونانی زبانوں کے ماہر تھے یکجا کیا اور تیسری طرف جندیسا پور کے ایرانی طبیبوں کو بغداد آنے کی دعوت دی،

طب اسلامی یونانی نہیں اسی ایک واقعہ سے سمجھا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے علم طب کو یونانی کہنا کہاں تک زیبا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے آج یوروپین طب کو اس لئے عربی کہا جائے کہ عربی زبان اور عربی طبیبوں کی کتابوں پر اس کی بنا ڈالی گئی تھی، اور سلرنو کا شہر اس کا پہلا مقام تھا، اس نظریہ پر ایک اور حیثیت سے نظر ڈالئے، ہماری طب میں جو دوائیں زیر استعمال ہیں ان کے زاد و بوم کی تحقیق یہ ظاہر کر دے گی کہ اس طب کو دنیا بھر کے تجربہ گاہوں سے یکساں تعلق رہا ہے، عرب اگر اس کا مولد، شام اس کا منشا، عراق اس کا گہوارہ، مصر اس کا بازیگاہ، اور اسپین اس کا مرغزار رہا، تو دوسری طرف ترکستان اس کی سیرگاہ، ایران اس کا تجربہ گاہ اور ہندوستان کی سرزمین اس کا دار الشباب ہے، اس طرح اسپین سے لیکر ہندوستان تک تمام طبی تجربے اس اسلامی طب کے اجزا و عناصر ہیں، قسط ہندی، عود ہندی، سازج ہندی، سنائے مکی، مصطگی رومی، آلوئے بخارا، اجوائن خراسانی، ثعلب مصری، نمک لاہوری، شقاقل مصری، ریوند چینی، دار چینی، صبر سقوطری، عشبہ مغربی، زہر مہرہ خطائی، زیرہ کرمانی، گل ارمنی، گل ملتانی،

گل داغستانی، بورہ آرمنی، افسنتین رومی، عقیق یمنی، گلنار فارسی، تربد اکبر آبادی، اسگند ناگوری، صمغ عربی، شیر خشت ولایتی، انار قندھاری یہ نام سرسری زبان پر آ گئے ہیں، ہمارے اطبا اس قسم کے اور بیسیوں نام بتا سکتے ہیں، لغات طب جیسے جامع ابن بیطار، تحفۃ المومنین، مجمع الجوامع اور مخزن الادویہ وغیرہ کا جائزہ لیا جائے تو بڑی فہرست تیار ہو سکتی ہے، جس کا دائرہ اسپین سے لے کر چین تک کی سرزمینوں کو محیط ہوگا،

عجم میں طب چھٹی صدی میں رشید الدین فضل اللہ سلطان غازان خاں کا حکیم اور وزیر تھا، اس نے تبریز اور ایران کے بعض شہروں میں شفا خانے قائم کئے تھے، جہاں کے استعمال کے لئے دنیا کے مختلف حصوں سے دوائیں منگوائی جاتی تھیں، پروفیسر براؤن آنجہانی نے ۱۹۲۱ء میں طب عربی پر چند لکچر انگریزی میں دیئے تھے جو چھپ چکے ہیں، اس کتاب میں رشید کے خطوط کے ایک قلمی نسخہ کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دواؤں کا یہ اہتمام تھا کہ امرا اور وزرا کی طرف سے وکلا اور ایجنٹ دنیا کے مختلف حصوں میں اس غرض سے بھیجے تھے کہ دوائیں اور ضرورت کی دوسری چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتے رہیں، ان مختلف ملکوں میں سے ایک نام ہندوستان کا بھی ہے جہاں دواؤں کی بہم رسانی کے لئے ایک ایجنٹ موجود تھا، دوسری صدی ہجری میں جب برامکہ بغداد کے وزیر تھے اُن کے ایجنٹ ہندوستان، کشمیر اور کاروندل تک دواؤں کی تلاش میں آتے تھے، اس کا ذکر ابن ندیم نے کیا ہے،

دنیائے اسلام میں طب طب عربی یا طب اسلامی کی شاندار تاریخ کے مطالعہ کا اگر شوق ہو تو ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطباء کی چار جلدیں ملاحظہ کی جائیں، جو صرف ساتویں صدی تک کے اطباء کے حالات میں ہے، اس کتاب کی تقسیم ملکوں پر ہے، ان چاروں جلدوں میں حسب ذیل ملکوں کے طبیبوں کے حالات اور تذکرے ہیں، یونان، عرب، مصر، شام، عراق، ایران، ترکستان، خراسان، ہندوستان، اسپین، مراکش، تونس والجزائر،

ہندوستان میں طب اہل نظر کو معلوم ہے کہ ایران اور ہندوستان میں اس طب کے فروغ کا زمانہ اس کے بعد آتا ہے، جن کے نام سے یہ کتاب خالی ہے، ضرورت تھی کہ اس کا تکملہ لکھا جاتا، خصوصاً آج جب کہ ہندوستان کے سوا ہر ملک سے یہ طب رخصت ہو چکی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان نے بھی اپنے زمانہ میں اس طب کی بڑی خدمت کی ہے، یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں یہ فن ایران اور ترکستان سے آیا اور اس نے یہاں آکر سلاطین و امراء کے زیر سایہ بڑی ترقی کی، یہاں بڑے بڑے شفاخانے اور دواخانے قائم ہوئے اور تجربہ کار محقق طبیبوں نے اپنی حذاقتوں سے اس کو چار چاند لگائے، تیموریوں سے پہلے فیروز شاہ کے عہد کا ایک ٹکڑا آپ کو سناتا ہوں، سراج عفیف لکھتا ہے

"چوں سلطان فیروز شاہ بجندیں تید مُوکلاں کہ آستانہ شفاخانہ و صحت خانہ برائے عامۂ مریضاں بنا فرمودہ و اطبائے حاذق و حکمائے صادق و خدمائے مصدق و جراحان و کحالان دراں مقام تعین گردانیدہ و ادویہ و اطعمہ و اشربہ برائے مریضاں از خزانہ مقرر کردہ باب کرم عام بشفقت تمام بر خلائق خاص و عام کشادہ۔"

شاہان ہندوستان کے دربار میں وید تیموریوں سے پہلے مسلمان طبیب اور ہندو وید برابر بادشاہی درباروں میں کام کرتے تھے، جن میں سے بعض بعض کے نام تاریخوں میں مذکور ہیں، سب سے پہلا برہمن جس کو ترک شاہانِ دہلی کے یہاں اعتبار رہا وہ بھی وید ہی تھا، جس کا نام گنگو برہمن تھا، جس کے نام سے جیسا کہ مورخین لکھتے ہیں بہمن شاہی سلاطین دکن پیدا ہوئے، کشمیر میں سلطان زین العابدین (د [illegible]ھ) کے عہد میں سری بھٹ نے ناموری حاصل کی، فرشتہ میں ہے،

"سلطان بجہت طبابت سری بھٹ را کہ طبیبے حاذق بود تربیت کرد۔"

ہندوستان میں اسلامی طب کی ترقیاں ہندوؤں کے ہاں مسلمانوں کی آمد سے پہلے طب میں چرک اور سشرت کی کتابیں مشہور تھیں، جن کا عباسیہ نے اپنے زمانہ میں ترجمہ کیا تھا، مسلمانوں کا علم طب اب ترقی پا کر عرب، یونان، ایران اور ہندوستان کے تجربات کا خلاصہ ہو چکا تھا، اور خود انھوں نے بہت کچھ اس پر اضافہ کیا تھا، اس لئے یہ

نیا علم طب ہندوستان کے قدیم علم طب پر امتیاز خاص رکھتا تھا، ہندوستان کے علم طب میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جو ترقیاں رونما ہوئیں وہ حسب ذیل ہیں،

۱۔ حاکم قوم اپنے علوم و فنون کو محکوم قوم کے علوم و فنون سے بہت بالادست سمجھتی ہے اور اس سے استغنا برتتی ہے، چنانچہ اسی علم طب کے متعلق دیکھئے کہ گذشتہ کونسل میں جب بعض ممبروں نے دیسی طب کی سرکاری حمایت کی اور اسکو مستند تسلیم کرنے کا رزولیوشن پیش کیا تو نااتفاقی کے ساتھ رد کر دیا گیا، لیکن مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ایسا نہیں کیا، ہندی علم طب کی بیسیوں کتابیں اُنھوں نے اپنی زبان میں منتقل کیں، اور اپنا علم طب ہندوستان میں پھیلایا، خاص اہل ہند کے مزاج اور طبیعت کا خیال کر کے خود انہی کے علم طب کو فارسی میں منتقل کیا اور شاہی حیثیت سے اسکو مستند قرار دیا، سلطان سکندر لودی سے خواص خان ایک درباری امیر نے عرض کی کہ جہاں پناہ یونانی طب ہندوستان کی آب و ہوا میں موافق نہیں ہے، حکم ہوا کہ سنسکرت سے ہندی طب کو فارسی میں منتقل کیا جائے، چنانچہ میاں بھوہ بن خواص خاں نے اس کام کو انجام دیا، اور کتاب کا نام معدن الشفاء سکندر شاہی رکھا، قاسم فرشتہ نے اکبری عہد سے پہلے اختیارات قاسمی کے نام سے ہندی علم طب کو زندہ کیا، ہندوستان میں اس وقت فارسی میں جو علم طب ہے، اور خصوصاً خاندانی اطبار کے سفینوں میں اور مجربات ناموں میں جو سیکڑوں نسخے اور دوائیں ہیں ہندوستان زا ہیں، اسی طریقے سے بیدوں نے مسلمانوں کے سیکڑوں نسخے، دوائیں اور اصول علاج اپنے ہاں لے لئے اور اسی طرح مل ملا کر ایک ایسا طرز علاج رائج کیا جو ہندوستان کے حالات کے مطابق تھا،

۲۔ پہلے بیدوں میں وہ دوائیں متداول تھیں، جو ہندوستان میں پیدا ہوتی تھیں، اطبائے اسلامی نے تمام دنیا کے ملکوں میں جو دوائیں اور جڑی بوٹیاں زیر تجربہ آچکی تھیں ان کو ہندوستان میں رواج دیا، ان کے فوائد اور منافع لوگوں نے سیکھے، مفردات کے ذخیرے کو بیحد بڑھا دیا،

۳۔ دواؤں کی ترکیب میں عرق، معجون، قیروطی، سفوف وغیرہ مختلف طریقوں کو پھیلایا،

۴- چیچک وغیرہ متعدد بیماریاں جن کو یہاں وہم پرستی سے دیوتاؤں، دیبیوں اور بھوت پریت کا اثر سمجھا جاتا تھا اور اس لئے ان کا طبی علاج نہیں کیا جاتا تھا، ان کو لائق علاج بنایا، چیچک کی بیماری پر سب سے پہلی کتاب عربوں ہی نے لکھی، اور وہ ابوبکر رازی کا رسالہ الحصبہ ہے جو چھپ کر عام ہو چکا ہے،

فن طب کو ہندوستان میں فروغ بہر حال مجھے کہنا یہ ہے کہ وہ طب جس کا ہیولیٰ دمشق میں تیار ہوا تھا اور جس میں زندگی کی روح بغداد میں ڈالی گئی اور جس میں شباب کی قوت شیراز پہونچ کر آئی تھی اُس نے دلی اگرہ میں حلہ اربعین کی منزل طے کی، اور اُس کی جوانی اپنے پورے کمال عروج کو پہونچی اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہندوستان کے بادشاہوں کی قدردانی نے اپنے انعامات سے اور ہندوستان کی سرزمین نے اپنے نباتات کی فراوانی اور دواؤں کی بہتات سے اس کے دواخانوں کو بھر دیا اور ہمارے طبیبوں نے پرانے ہندوستان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں بیجا ترم نہیں کی،

ہیچ گہ ذوق طلب از جستجو بازم نہ داشت — دانہ می چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

ہندوستان کے نامور اطبا اکبر کے زمانہ کے نامور طبیبوں کے نام سنئے، حکیم الملک گیلانی، حکیم سیف الملوک دماوندی، حکیم زنبیل شیرازی، حکیم عین الملک شیرازی، حکیم مسیح الملک شیرازی، حکیم مصری، حکیم علی، حکیم ابو الفتح گیلانی، حکیم حسن گیلانی، حکیم ہمام تبریزی، حکیم احمد ٹھٹھوی، حکیم لطف اللہ گیلانی، حکیم مظفر اردستانی، حکیم فتح اللہ گیلانی، شیخ بینا سرہندی جراح، جہانگیر کے عہد میں چند اور نامور ہوئے حکیم رکنائے کاشی، حکیم مسیح الزماں کاشی، حکیم الملک ابو القاسم گیلانی، حکیم مومنائے شیرازی، حکیم روح اللہ بھروچی، حکیم حمید گجراتی، حکیم تقی گیلانی،

شاہجہاں کے عہد نے چند اور مشاہیر کا اضافہ کیا، حکیم علیم الدین، حکیم صدائے شیرازی، حکیم الملک حکیم ابو القاسم، حکیم رکنا کاشی، حکیم مومنائے شیرازی، حکیم فتح اللہ شیرازی، حکیم محمد داؤد، مقرب خاں جراح، شیخ قاسم جراح، اور آخر زمانۂ مغلیہ میں حکیم علوی خاں دہلی میں اور حکیم یعقوب نے لکھنؤ میں

اس فن کو چار چاند لگائے،

مسلمانوں کے دوش بدوش اکبر کے عہد میں چہادیو، بھیم، ناتھ، نارائن اور شیوجی ہندو طبیب اور وید مشہور ہوئے، عالمگیر کے عہد میں حکیم سکھراج نے شہرت پائی، عالمگیری و محمد شاہی دور میں حکیم لچھمی نرائن بہار گنجاری نے ناموری حاصل کی، اسی پٹنہ میں کمپنی کے راج میں منشی رام پرشاد تھے جنھوں نے ۱۲۴۷ھ میں معیار الامراض نام کتاب لکھی تھی، جس میں سر سے لے کر ناخن تک کے تمام امراض کے قوانین کلیہ درج ہیں، اسی زمانہ کا شخص حکیم رائے منولال فلسفی المتوفی ۱۲۴۸ھ ہے، مفردات طب نام اس نے ایک کتاب لکھی، لالہ سوہن لال سندیلوی اسی عہد کا ایک اور طبیب تھا، اُن کے علاوہ بچولال تکمین بیدا آبادی مجربات طبی کا مصنف، پنڈت لالہ چند کحل الابصار کا مصنف، دیاناتھ جس نے ویدک سے پاکا ہون کا ترجمہ فارسی میں کیا، منشی مہتاب نراین جس نے ادویہ کے خواص میں ضروری الطب لکھی،

ویدک اور طب کا لین دین اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ مسلمان طبیبوں نے جہاں ہندوستان سے بہت کچھ لیا، اس کو بہت کچھ دیا بھی، ہمارے بزرگوں کی قلمی کتابوں اور سفینوں میں ویدک نسخے بکثرت ملتے ہیں، اسی طرح ویدوں نے طبیبوں اور طبی کتابوں کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا، یہ دنیا اسی دادوستد پر قائم ہے اور اسی طرح قائم رہے گی،

طب کی تجدید حضرات! یہ تو ماضی تھی، اب حال و مستقبل کی بھی فکر چاہئے، زمانہ کے حالات بدل گئے ہیں، اب طب اور وید کے علاوہ سات سمندر کی نئی طب بھی سامنے ہے، جس کا آغاز گو عربی ہی طب سے ہوا ہے مگر تجربات کی فراوانی، آلات کی عمدگی، اور سلطنتوں کی قدردانی نے اس کو وہ دن دکھائے کہ تاج شاہی اب اس کے سر پر ہے اور خلعت قبول اس کے جسم پر ہے، لیکن غور کے قابل بات یہ ہے کہ عام شاہی قدردانی کے نہ ہونے سے گو اکثر قدیم مشرقی علوم و فنون موت کے گھاٹ اتر گئے ہیں تاہم طب اور ویدک اب بھی اس کے مقابلہ میں تین سو برس کے بعد بھی کھڑے ہیں، اور قبول عام کے زور سے زندہ ہیں،

حالانکہ یہ وہ فن ہے جس کا تعلق موت وحیات اور زندگی جیسی قیمتی چیز سے ہے، تاہم ملک کی لاکھوں جانیں بخوشی ان کے حوالہ کی جا رہی ہیں اور شفایاب ہو رہی ہیں، چنانچہ اب حکومت نے بھی چند سال سے اسکی بقا کی ضرورت سمجھی اور لکھنؤ، علی گڑھ، پٹنہ اور ڈھاکہ میں سرکاری امدادوں نے اس کی ترقی کا کچھ سامان کر دیا ہے، اسی سلسلہ میں مجھے چند باتیں عرض کرنی ہیں،

اس فن طب کی پچھلی تاریخ سے یہ ظاہر ہے کہ اس نے دوسری قوموں کے تجربوں سے فائدہ اٹھانے میں کبھی تعصب کو راہ نہیں دی ہے، اس بنا پر اس زمانہ میں جو نئے نئے تجربے اور نئے نئے نظریئے اور جدید طریق تشخیص اور ادویہ سازی کے جو طریقے پیدا ہو گئے ہیں ان سے بھی وہ پوری طرح مستفید ہوگا، چنانچہ ہمکو معلوم ہے کہ بعض انگریزی دوائیں اسمیں ابتدا ہی میں رواج پا گئیں، کنین اور انگریزی سالٹ کے نام ملتے ہیں، اسی طرح بعض دوسرے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں گریز نہ کرنا چاہئے، نیز بعض قدیم اصول وبیانات جن کی تائید تجربہ اور تحقیق سے نہیں ہوئی اس کی صحت پر اصرار کرنے سے فائدہ نہیں، مثلاً یہ اصول کہ اعدل اماکن الارض سکان خط الاستواء، محض غلط قیاسی دعویٰ ہے جس کی تردید ابن رشد وابن خلدون وغیرہ نے بہت پہلے کر دی اور یہ صرف یونانیوں کے ناتمام علم جغرافیہ کی بنیاد پر قائم ہے جو آج تک ہماری عام کتابوں میں اسی طرح زیر درس ہے، اسی طرح موجودہ طب جو اخلاط اربعہ کے نظریہ پر قائم ہے، اپنی حد میں بالکل صحیح ہے، لیکن محض یونانی قیاسات طبعی کی بنا پر دواؤں میں کیفیات اربعہ کے وجود پر زور دینا قیاس سے تجربہ کو رد کر دینا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ متاخرین نے اپنی تحقیقات میں تجربوں کے مقابلہ میں اس قیاسی چیز کی اہمیت کم کر دی ہے،

نظریۂ اخلاط اور جراثیم نظریۂ اخلاط اربعہ کی تشریح یہ ہے کہ طب کا اصول یہ ہے کہ المعدۃ بیت الداء، باہر سے انسان کے پیٹ میں جو چیز عموماً جاتی ہے وہ غذا ہے، غذا کے طبخ صحیح وعدم طبخ سے اخلاط اربعہ کا وجود ہوتا ہے، ان کے توازن وعدم توازن سے مزاج کا اعتدال وانحراف ہوتا ہے اور صحت و

مرض کا وجود ہوتا ہے، یہ تشریح تمام تر تجربی اور سراسر صداقت ہے، ڈاکٹری میں ادھر کچھ دنوں سے جراثیم کی وبا پھیلی ہے، ہر چیز جراثیم کا مخزن ہے اور علم الامراض علم جراثیم کا دوسرا نام ہو گیا ہے، اب وہ آنکھوں سے نظر آتا ہے، اور اس کی تحقیق روز بروز بڑھ رہی ہے، اس کو اس حد تک ماننے میں کیا حرج ہے کہ غذا اور پانی اور سانس کی ہوا کے ساتھ جراثیم شامل ہو کر فساد کا باعث ہوتے ہیں،

طب اور آلات کا استعمال تحقیقات کے معاملہ میں آلات سے کام لینے میں بھی بخل نہ چاہئے، علم جراحی اور کحالی اور دایہ گری جو ہماری طب کی شاخیں تھیں وہ رفتار زمانہ سے ایسے جاہل طبقوں میں پہنچ گئیں کہ ہمارے اطباء سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں رہا، ضرورت ہے کہ ان کٹی ہوئی شاخوں کو پھر اصل فن سے ملایا جائے، طب قدیم کی تاریخ اور شفاخانوں پر حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی مرحوم نے ۱۸۹۲ء کے درمیان یعنی آج سے اٹھاون برس پہلے جو کچھ لکھا تھا، اور خاکسار نے زہراوی اندلسی کی تصریف سے ۱۹۰۸ء کے قریب الندوہ میں جو کچھ لکھا تھا ضرورت ہے کہ ہمارے اطباء ان تحقیقات تاریخی میں وقتاً فوقتاً اضافہ فرماتے رہیں،

قدیم کتب طب کی فراہمی ہمارے طبی مدرسوں میں قدیم طبی کتابوں کی فراہمی اور حفاظت کا بھی سامان کیا جائے، ادھر کامل الصناعۃ اور حاوی کی اشاعت نے کچھ اطباء میں دلچسپی پیدا کی ہے، ابن طبری کی کتاب فردوس الحکمۃ ایک بہاری فرزند ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کی تصحیح سے برلن میں ۱۹۲۸ء میں چھپی ہے، محمد بن زکریا رازی کی برء الساعۃ جس کو فرسٹ ایڈ کہتے ہیں، پیرس سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی، اسی مصنف کی کتاب گردوں اور مثانوں کی کنکریوں کے علاج میں مقالہ فی الحصی فی الکلی والمثانہ لائیڈن سے ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی، اور اب آج کل دائرۃ المعارف حیدرآباد میں عمدۃ الجراحین ابن القف اور مختارات ابن ہبل زیر طبع ہیں، عمدۃ الجراحین کا موضوع یہ ہے کہ بغیر آپریشن کے زخموں کا علاج کیا جائے، مصر کے ایک لائق ڈاکٹر احمد عیسیٰ بے نے عربوں کے آلات طب وجراحی وکحالی پر ایک نہایت محققانہ مقالہ لکھا ہے، اور مع تصاویر کے شائع

کیا ہے، چند سال ہوئے کہ قانون بو علی سینا کا ترجمہ لندن سے انگریزی میں شائع ہوا ہے، اگر ہمارے اطبا میں سے کچھ اہل علم قدیم کتب طب کی تلاش و جستجو اور اشاعت کا کام انجام دیں تو اس فن کے بہت سے مردہ تجربات کو زندہ کر دیں گے، تجربات کو چھپانے کی پرانی بیماری اب زائل ہو جانی چاہئے،

عمدہ اور تازہ دواؤں کی فراہمی ہماری طب کی کمزوری کا ایک بڑا سبب عمدہ اور تازہ دواؤں کی بہم رسانی کی طرف سے پوری غفلت ہے، اب تک یہ کام پنیوں اور خالص دوکانداروں کے سپرد ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عمدہ اور تازہ دواؤں سے ہم محروم رہتے ہیں، اس پوری مجرمانہ غفلت کے باوجود اگر ان مفردات سے فائدہ پہنچتا ہے، تو اس طب کی یہ بھی کرامت ہے،

مفردات اور مرکبات مفردات کے بعد پھر مرکبات کی تیاری کا سوال ہے، محسن طب جناب حکیم مسیح الملک مرحوم نے جب سے ہندوستانی دواخانہ کی بنیاد ڈالی ہے بے شبہہ مرکبات کی عمدگی اور صفائی کے کام نے بہت ترقی کی ہے، مگر ابھی تک اس کا اثر صرف چند شہروں تک محدود ہے،

مفردات سے علاج کا اسکول جو لکھنؤ میں رواج پذیر تھا وہ اس لحاظ سے کہ ہر نسخہ ہر شخص کے موجودہ حالات کے مطابق ہوتا تھا، بہت کامیاب تھا، مگر صرف اس لئے کہ اس کا گھسنا اور لگانا دردسر یہ بھی تو ہے، اب سرعت سے اس کی جگہ مرکبات سے علاج کا طریقہ سہل الحصول ہونے کے سبب سے لے رہا ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ ہر مرض کے علاج میں نہیں چل سکتا، اس لئے ضرورت ہے کہ مفردات سے فی الفور جوشاندہ بنانے کا وہ طریقہ جو حیدرآباد دکن کے شفاخانہ طبی میں زیر عمل ہے قبول کر لیا جائے، یعنی عطاروں کے یہاں گرم پانی کا اہتمام خاص رکھا جائے اور ہر نسخہ کا جوشاندہ اور تازہ عرق فی الفور نکال کر حوالہ کیا جائے،

حیدرآباد دکن کا طبی شفاخانہ مجھے حیدرآباد دکن کے اس طبی شفاخانہ، دواخانہ اور کلیۂ طبیہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، یہ پورا ادارہ اس بات کا ثبوت ہے، کہ حکومتوں کی سرپرستی سے یہ طب کتنی ترقی

پا سکتی ہے، اعلیٰ حضرت نظام خلد اللہ ملکہ کی شاہانہ توجہ سے اس طب نے جو ترقیاں کی ہیں، طریقۂ دواسازی، دواؤں کے رکھنے کی ترکیب، جوشاندہ بنانے کا طریق، آلات کا استعمال، مریضوں کی تیمارداری، دیکھ بھال، سامان ہر چیز میں یہ شفاخانہ اسپتالوں کے بالمقابل ہے، اسی طرح اس کا طبیہ کالج لائق اساتذہ اور تجربہ کار معلمین نصاب، طریقۂ تعلیم، مدت تعلیم، علمی و عملی تعلیم کتب خانہ اور دیگر شعبوں کی بنا پر وہ نمونہ ہے، جس کی مثال دنیا میں اس وقت کہیں نہیں، ڈاکٹری کی بے شمار کتابیں اردو میں اصطلاحات کے ساتھ دار الترجمۂ عثمانیہ نے اردو میں منتقل کر دی ہیں،

دیسی طب کی حمایت بے شبہہ خوشی کی بات ہے کہ اصلاحات ہند کے رواج کے بعد حکومت انگریزی کے بعض صوبوں نے دیسی طب کی حمایت و حفاظت کی طرف توجہ کی ہے، لیکن صاف کہنا چاہئے کہ یہ عمل ایمان کے بغیر ہے، اس لئے حمایت و حفاظت و اعانت بیدلی کے ساتھ کی اور دی جا رہی ہے، اسی لئے بعض غلطیوں کا علانیہ ارتکاب کیا جا رہا ہے، اور ہم اس لئے اس کو احسان مندی کے ساتھ قبول کرتے ہیں کہ ایک غیر حکومت کی طرف سے اتنی ہمدردی بھی بہت ہے،

طب کی زبان پہلا مسئلہ تعلیم کا ہے، اس طب کی ساری مستند کتابیں عربی میں ہیں اور کچھ فارسی میں ہیں، گو ایک بہاری طبیب حکیم کبیر الدین صاحب شاگرد رشید حکیم اجمل خاں مرحوم کے ہم سب ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنی محنت اور قابلیت سے اس فن کا اچھا خاصہ ذخیرہ ہماری زبان میں منتقل کر دیا ہے، اور اس نے ہماری طبی درسگاہوں میں رواج پایا ہے، تاہم نقل اصل کو نہیں پا سکتی، اس لئے اگر یہ سرکاری طبی درسگاہیں صرف اردو کے ذریعۂ تعلیم طب کے رواج پر عمل کریں گی تو فن کے زوال میں کوئی شبہہ نہیں، ایلوپیتھی کے لئے اگر انگریزی زبان کی ضرورت اور سائنس کے ذریعہ سے اعلیٰ کامیابی پر داخلہ میڈیکل کالج میں مشروط ہے تاکہ اعلیٰ قابلیت کے ڈاکٹر پیدا ہوں تو طب کے لئے نیم ملا عربی داں اور معمولی انگریزی داں و اردو خواں بلا امتیاز طب کی درسگاہوں میں داخلہ کی اجازت کیوں پاتے ہیں،

کیوں نہ اس میں بھی اعلیٰ قابلیت کے لڑکوں کا انتخاب عمل میں آئے

طبیب ڈاکٹر نہ بنیں

اسی طرح کا تعلیمی نقص ترقی کے نام سے ان درسگاہوں میں پھیلایا جارہا ہے اور وہ ایلوپیتھی کے ناقص طریقوں کی ادھوری تقلید کا شوق ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری اُن درسگاہوں کا طبیب، طبیب سے زیادہ ڈاکٹر بننے کا شائق ہے، اور لفظوں سے خوش ہوتا ہے، وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے طور وطریق میں بھی ڈاکٹر معلوم ہو، یہ حد درجہ مذموم طریقہ ہے، یہ کوے کے ہنس کی چال اختیار کرنے کا طریقہ ہے،

طب اور مذہب

ہمارے دوسرے مشرقی فنون کی طرح ہماری طب بھی ہمارے مذہبی فرائض ہی کا ایک گوشہ ہے، اسی لئے ہمارے پرانے طبیب نیچر اور فطرت کے بے ارادہ، بے رحم اور غیر مستولی دیوتاؤں کے بجائے، شافی مطلق، ہمہ رحم یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید خدا کے پرستار تھے، انکی کتاب کا آغاز صدائے ابراہیمیؑ اذا مرضت فھو یشفین اور آیت الٰہی فیہ شفاء للناس اور حدیث لکل داء دواء اور کلمہ منسوبہ بہ سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان سے ہوتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے فنون کی طرح یہ فن بھی دین ہی کے تحت میں تھا، اسی لئے ہمارے طبیب کے ہر نسخہ کا طرۂ پیشانی طغرائے ہوالشافی سے مزین ہوتا تھا، وہ ہر مریض کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے ساتھ شافی مطلق کے سامنے سرنگوں ہو جاتا تھا، وہ ہر مشکل کے وقت اور سی مشکل کشا کے رو برو دست بدعا ہوتا تھا وہ مغرورانہ حتمی احکام لگانے کے بجائے ہمیشہ انشاء اللہ تعالیٰ کے دامن میں اپنے لئے پناہ ڈھونڈھتا تھا، وہ اپنی تدبیروں اور دواؤں کی تاثیرات کو اپنی فکر، نظر و تدبیر یا دواؤں کے طبعی خواص کی طرف منسوب کرنے کے بجائے مدبر حقیقی اور موثر تحقیقی، یکم علی الاطلاق جل شانہ کی طرف منسوب کرکے اپنے کو بندۂ بے اختیار ظاہر کرتا تھا، میں نے اس شہر کے ایک پرانے ڈاکٹر صفدر حسین صاحب کو دیکھا تھا، جنھوں نے غدر سے پہلے ڈاکٹری اردو میں پڑھی تھی او

اور اس سال پاس ہوئے تھے، جب واجد علی شاہ قید کرکے مٹیا برج لائے گئے تھے، ان ہی نے ہمارے صوبہ میں ہومیوپیتھک کو پہلے رواج دیا ہے، میں نے ان کو پرانے طبیبوں کی طرح ہمیشہ اسی حال میں دیکھا کہ وہ ہر علاج کے وقت شافیِ مطلق کی طرف متوجہ اور دست بدعا رہتے تھے، ان کا ایک فقرہ ہمیشہ یادگار رہے گا، فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ اندھیری کوٹھری میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولتے ہیں،

نوجوان طبیبوں کو نصائح

نوجوان طبیبو! اب آپ زندگی کے میدان میں اتر رہے ہیں، آپ کو دکھ سے بھرے انسان ملیں گے، ان سے ہمدردی کرنا آپ کا فرض ہوگا، کبھی آپ بیمار بن کر دیکھیں کہ طبیب کی ایک شفقت بھری نگاہ مایوس مریض کے لئے کس طرح آبحیات کا جام نوشین بنجاتی ہے، حرص طمع اور دولت دنیا کے لالچ سے ایک شریف طبیب کا دامن پاک ہونا چاہئے، آپ کا تعلق کائنات کے اس راز سربستہ سے ہے، جس کا نام موت وحیات ہے، آپ کے سامنے خدا جانے موت وحیات کے کیسے کیسے موثر اور حیرت انگیز واقعات اور دل کو کپکپانے والے حادثے آئیں گے، ان حادثوں سے ایمان باللہ، اور ایمان بالیوم الآخر کی قوت میں اضافہ کا کام لیں، آپ کے شہر کے ایک دیندار و خوش نام ڈاکٹر نے خوب فرمایا کہ ہم بیماری کا علاج کرتے ہیں، موت کا نہیں،

جائیے اور متوکلاً علی اللہ خلق کی خدمت میں مصروف ہوجائیے اور بلا تفریق مذہب وملت عزیزوں کی غمخواری اور بیماروں کی تیمارداری اور دکھی لوگوں کے دکھ درد کو امکان بھر اخلاص اور ایمانداری اور محنت اور دیانت سے کم کرنے کی کوشش کیجئے، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے، اور آپ کو فہم صحیح، دست شفا اور رزق حلال عنایت فرمائے،

والسلام

مجدد ملت

اور

قومیات وسیاسیات حاضرہ

از مولانا شاہ عبد الباری صاحب ندوی

حضرت حکیم الامۃ تھانویؒ کے خلیفہ مجاز مولانا شاہ عبد الباری ندوی اب مجدد وقت کے تجدیدی کارناموں پر ایک مبسوط کتاب تیار کر رہے ہیں، ذیل کا مقالہ اسی کتاب کا ایک باب مع دیباچہ وخلاصہ کے ہے، مولف ممدوح نے اپنے امکان بھر کوشش اس کی کی ہے کہ حضرت مولاناؒ کی تعلیمات وہدایات کی صحیح صحیح ترجمانی وتعبیر کر دیں، اور اس کوشش میں وہ قابل مبارکباد حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں، پھر بھی بشر بشر ہی ہے' معارف میں اس کی اشاعت سے مقصود یہ ہے کہ دوسرے ارباب نظر بھی اسے ملاحظہ فرمائیں اور جہاں جہاں ان کو فروگذاشتیں نظر آئیں ان سے مولف سلمہ اللہ کو مطلع کر دیں، حضرتؒ کے منتسبین سے یہ التماس خصوصیت کے ساتھ ہے، سب سے پہلے ان تمہیدی سطور کا راقم، خود اس فرض کو ادا کرتا ہے، اور جہاں جہاں کوئی بات اسے لفظی یا معنوی حیثیت سے کھٹکی ہے اس کا وہ بے تکلف اظہار کرتا گیا ہے، تنقید میں مروت، تقاضائے اخلاص کے بالکل منافی ہے۔"

"عبد الماجد دریابادی"

دیباچہ دین کی تکمیل وتحفظ کے بعد نبوت کا ختم ہو جانا بالکل قدرتی امر تھا یعنی جب دین کا ہر جہت سے اور ہمیشہ کے لئے اکمال واتمام فرما دیا گیا، اور قیامت تک اس کی حفاظت کی ضمانت بھی فرما لی گئی، تو ظاہر ہے

کہ اب کسی نئی وحی کی کیا ضرورت رہی، البتہ ایک اور ضرورت رہ جاتی ہے، امتداد زمانہ سے بشری فطرت، نفس ونفسانیت اور اتباع ہوئی وغیرہ کے خارجی عوامل کی بدولت کامل ومحفوظ دین کے احکام وتعلیمات کی بھی فہم وتفہیم اور عمل واجراء میں طرح طرح کے خلل وفساد کا لاحق ہوتے رہنا ناگزیر تھا، کوئی چہرہ بذات خود حسن وجمال کے خواہ سارے صفات کمال سے متصف ہو، مگر خارجی وعارضی گرد وغبار اس کو بھی مکدر کر ہی دیتا ہے، جس سے صاف کرتے رہنے کی ضرورت وقتاً فوقتاً پڑتی ہی رہتی ہے۔

دین کامل کے چہرۂ کمال وجمال سے اسی گرد وغبار کو جھاڑتے رہنے کے لئے بعثت انبیاء کو ختم کرنے کے بعد بعثت مجدد دین کا سلسلہ صدی بصدی جاری فرمایا گیا، تاکہ طالبان حق کج رویوں سے بچ کر ہمیشہ "صراط مستقیم" ملتی رہے، اور "ضالین ومغضوبین" کی گمراہیوں سے محفوظ رہیں، خیر القرون سے جتنا بعد بڑھتا جاتا ہے، دینی کجراہیاں اور فتنے بھی بڑھتے جاتے ہیں، لہذا ہر وقت اور ہر عہد میں مسلمانوں کو اس وقت کی کجراہیوں اور گمراہیوں سے محفوظ رہنے کے لئے مجدد وقت کو معلوم کرنا اور اس کی تجدیدات وقت کی پیروی کرنا، اسی میں سلامتی ہے،

البتہ نبی اور مجدد میں ایک فرق یہ ہے کہ نبی وقت پر ایمان نفس نجات ومغفرت کے لئے لازم ہے، بخلاف اس کے مجدد وقت کی یافت وپیروی پر نجات موقوف نہیں، وہ تو انشاء اللہ خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان کے بعد مرتب ہو کر حاصل ہی ہو جائیگی، لیکن دین کے اصلی پاک وصاف سرچشمہ تک پہنچنا، اسکی کامل وبے غبار تعلیمات کو سمجھنا اور ان پر عمل کی دینی ودنیوی برکات کا پوری حاصل ہونا، اس کے لئے بلاشبہہ مجدد وقت کا پانا اور اس کا دامن تھامنا لابد ہے، ورنہ پھر بعثت مجدد دین اور تجدید دین کے کوئی معنی نہیں، بلاشبہہ مجدد نبی کی طرح معصوم نہیں ہوتا، بشری لغزشیں اس سے بھی ہونگی، لیکن دیگر علماء و محققین کے مقابلہ میں نسبۃً بہت کم، اس لئے مجدد وقت کی تجدید وتحقیق کا قبول واتباع اسلم واحوط ہر حال میں ہوگا،

مسلمانوں کی حالت کم و بیش ہر لحاظ سے روز بروز روبہ تنزل ہی نظر آرہی ہے، قومیات و سیاسیات یا دنیوی معاملات تک میں جن راہوں اور تدبیروں سے غیروں کو ان کی مزعوم و مطلوب ترقی و کامیابی حاصل ہوتی ہے، انہی راہوں سے اور انہی مقاصد کے لئے مسلمانوں کا حصہ ناکام نقالی کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے،

راقم احقر کوئی قومی و سیاسی آدمی بالکل نہیں، اور نہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے موجودہ قومیات و سیاسیات کا اسلام کے اصول و مقاصد یا طریق کار سے کوئی سروکار سمجھ میں آتا ہے، تاہم الحمد للہ برا بھلا مسلمان ہوں اور برے بھلے مسلمان بھائیوں کی زبون حالی پر دل کڑھتا ہے، ان کے کسی قومی یتیم خانہ کا حال سنو تو ابتر، کسی مدرسہ کا حال دیکھو تو بد سے بدتر، جس ادارہ پر بھی نظر ڈالو "ہر روز بتر می بینم" ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے، سب سے زیادہ شور و غل سیاسیات کا ہے، مگر اس ڈھول کے اندر بھی پول ہی پول ہے بلکہ مسلمانوں کے حق میں سب سے زیادہ فتنہ و شر، ناکامی و نامرادی اسی میں دکھلائی دیتی ہے،

بعض تازہ واقعات سے دل پر زیادہ چوٹ لگی، مسلم لیگ کے ساتھ وفد وزارت اور وائسرائے سب کی طوطا چشمی و استخفاف یا غداری جو کچھ بھی کہو اس کا بڑا سبب یہی ہوا کہ کانگریس کے مقابلہ میں لیگ کی اندرونی کمزوریوں کی بنا پر اس کو زیادہ خاطر میں نہیں لایا گیا، بظاہر مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت مسلم لیگ کی ہم آواز ہے، مگر وہی آواز دہل کہ اندر سے خالی اور دل ہم آہنگ نہیں، ذاتی و انفرادی اغراض و مطالبہ کا غلبہ، انتخابات میں غیر معمولی کامیابی کے باوجود خود مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں لیگی وزارتوں کا حال دوست و دشمن سب کے سامنے ہے، کلکتہ، بمبئی وغیرہ میں ہزاروں بے گناہ مسلمان، بچوں، بوڑھوں، عورتوں تک کا جس درندگی کے ساتھ قتل عام ہوا، اس کے تصور سے بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے، دوسروں پر اس کا الزام چاہے جتنا دھرا جائے اور قانون و کمیشن کی نگاہ میں چاہے سراسر دوسروں ہی کی زیادتی ثابت ہو، تاہم اس کا حقیقی اور بڑا سبب اوپر سے نیچے تک خود ہماری جماعتی ابتری

و بدنظمی، عدم انضباط و عدم تربیت کے سوا کیا ہے،

ہمارے جماعتی امراض میں سب سے مہلک مرض یہی ہے کہ ہمارا کوئی کلمہ جامعہ نہیں جس پر ہم زبان و دل دونوں سے جمع ہوں، مسلمان مسلمان رہ کر صرف اسلام ہی پر جمع ہو سکتے تھے، اور اس پر جمع ہونے کی صورت سیاسی غیر سیاسی چھوٹے بڑے کسی مسئلہ میں یہی ہو سکتی تھی کہ کسی ایک رائے پر جمع ہو جائیں، یہ نہیں کہ جس لیڈر یا اڈیٹر، جس عالم یا مولوی کا جدھر جی چاہے چل پڑے، جو مسلک چاہے اختیار کرے، اور پھر سارے مسلمانوں کو اس کی طرف بلانے لگے، یہ تو وہی اعجاب کل ذی رای برائہ کی خودرائی ہے جس کا نتیجہ اس فشل اور ذہاب ریح یا ہوا خیزی یا پست ہمتی کے سوا کیا ہو سکتا ہے، جو دن رات آنکھوں کے سامنے ہے،

لہذا اہم و مقدم سوال یہ طے کرنے کا ہے کہ وہ ایک رائے جس پر مسلمانوں کو جمع ہونا چاہئے، کون اور کس کی ہو سکتی ہے؟ اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے لئے اس کا جواب ایک ہی ہے کہ مجدد وقت کی تجدیدی رائے، اس لئے کہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی عہد میں خاص طور پر اسلامی احکام و تعلیمات کے احیاء و تجدید ہی کے لئے مبعوث فرمایا گیا ہو، اس سے بڑھ کر دینی اعتبار سے قومیات و سیاسیات حاضرہ میں اور کسی کی رائے قابل اعتنا و اتباع ہو سکتی ہے،

راقم ہذا آج کل عہد حاضر کے جامع المجددین حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی علیہ الرحمہ کی اسلامی زندگی سے متعلق ہر شعبہ کی تجدیدات ہی کو ایک مستقل کتاب کی صورت میں جمع و مرتب کر رہا ہے، اور اتفاق وقت سے اس وقت قومیات و سیاسیات حاضرہ ہی کا باب زیر تحریر تھا، اس لئے تازہ واقعات سے مجروح و متاثر قلب میں اس کو پیش کر دینے کا تقاضا ہوا، لیکن احقر نہ کوئی چھوٹا بڑا لیڈر نہ مولوی، نہ کانگرسی نہ لیگی کہ اس کے معروضات قابل توجہ کیا قابل سماعت بھی ہوں، تاہم "گاہ باشد کہ کودک ناداں" کے احتمالی فقرہ کے مطابق ممکن ہے کوئی قابل قبول بات نکل آئے،

اس کے علاوہ، راقم کی حیثیت اصل میں جامع یا زیادہ سے زیادہ کہیں کہیں شارح کی ہے، سو اگر جمع و شرح میں کہیں غلطی یا غلط فہمی ہوئی ہو تو اس سے قطع نظر فرما کر بلکہ احقر کو آگاہ و متنبہ فرما کر، خود حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی اس باب میں جو تجدید و تحقیق ہے، اس پر تعصب و تحزب سے خالی الذہن ہو کر اگر توجہ فرمائی تو انشاء اللہ نفع سے خالی نہ ہو گی، ان حضرات سے خصوصاً اس کی درخواست ہے، جو حضرت علیہ الرحمہ سے ارادت و عقیدت کی کوئی نسبت رکھتے ہیں، کہ وہ ان معروضات پر خاص توجہ فرمائیں، اور اگر حضرت کی رائے و تحقیق کے پیش کرنے میں کوئی خطا نظر آئے تو اس کی تصحیح سے ضرور مطلع فرمائیں تاکہ کتاب کی اشاعت میں لحاظ رکھا جائے، وما توفیقی الا باللہ،

بظاہر حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ کے تجدیدی اوراق حیات کا یہ ورق بالکل سادہ معلوم ہوتا ہے، اور یہ صحیح بھی ہے کہ متعارف قومی و سیاسی تحریکات میں حضرت نے کبھی کوئی عملی حصہ نہیں لیا، اور بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں کوئی تجدیدی و اصلاحی خدمات بھی نہیں انجام دیں، بات یہ ہے، کہ قومیات و سیاسیات حاضرہ کا عملی پہلو ہی دینی اعتبار سے زیادہ غیر عملی ہے، ان کا بڑا وصف یہ ہے کہ کام بہت کم اور نام بہت زیادہ، خیر بہت کم شر بہت زیادہ اور اس نام و نمائش کے شور و غل میں اوقات الگ ضائع، سب سے بڑھکر یہ کہ قدم قدم پر طرح طرح کے دینی مفاسد میں آلودگی و ابتلا، پھر اس غل غپاڑہ میں پڑ کر کسی بڑے سے بڑے صحیح الدماغ دینی یا دنیوی خادم یا رہنما کا اتنا توازن دماغی برقرار رہنا مشکل کہ وہ حدود و اعتدال کو محفوظ رکھ سکے، جو اسلامی صراط مستقیم کی خصوصیت خاصہ ہے، اور حضرت مجدد وقت علیہ الرحمہ کی حکیمانہ و مجددانہ خدمات و اصلاحات کا سب سے نمایاں وصف،

اس لئے ان نام نہاد قومی و سیاسی تحریکات یا انجمن سازیوں، جلسہ بازیوں، نعرہ زنیوں، اخبار فروشیوں، اور ووٹ خریدیوں، ہڑتالوں، بائیکاٹوں وغیرہ کے جو طرح طرح کے آئے دن طوفان بے تمیزی برپا رہتے ہیں، ان کی طرف نہ خود طبعاً، عقلاً یا شرعاً کسی طرح رخ فرما سکتے تھے اور نہ کسی کو مشورہ دے سکتے

تھے، خالص دینی خدمات تک میں ان پر مفاسد ذرائع سے کام لینا پسند نہ تھا، خدمات تبلیغ کے سلسلہ میں ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ

"ہر ضلع میں ایک مجلس قائم کر دیجائے جس کا نام وغیرہ رکھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں عہدہ داروں کے نام مقرر کرنے کی ضرورت کیونکہ آج کل انجمن کے قوانین اور عہدہ داروں کی فہرست میں تو رجسٹر سیاہ کر دیئے جاتے ہیں، مگر کام نہیں ہوتا،" (قواعی بالحق منڈ)

پھر قومیات و سیاسیات حاضرہ کے بازار میں قومیت و وطنیت، جمہوریت و اکثریت، انقلاب و بغاوت، حریت و مساوات وغیرہ کے ظاہر فریب ناموں سے جیسے جیسے کھوٹے اور جعلی سکے رائج رہیں ان کو جوہر شریعت کی معمولی پرکھ رکھنے والا بھی اپنی جیب میں نہیں ڈال سکتا، تو بھلا جو مجدد وقت شریعت مطہرہ کو ہر کھوٹ کی ادنیٰ سے ادنیٰ آمیزش سے پاک و صاف فرمانے ہی کے لئے مبعوث فرمایا گیا ہو وہ ان جھوٹے جعلی سکوں کو سرے سے بدل ڈالنے کے سوا ان میں اصلاح کی کیا گنجائش دیکھ سکتا تھا،

قومیت نام ہے رنگ و نسل، ملک و وطن، یا کسی خاص و خالص مادی تہذیب و تمدن کے خود تراشیدہ اور غیر اختیاری و خارجی امتیازات و معیارات پر مبنی جماعتی تصور کا جس کو اسلام کے دشمن بھی اب جان گئے ہیں کہ قومیت کا یہ تصور، اسلام کی عین ضد ہے، اور اسلامی شریعت ایسے قوانین سے مطلقاً ناآشنا ہے، جن میں حق و انصاف، عطا و منع، جنگ و صلح ترجیح و تفوق کی کسوٹی کھال کا کوئی رنگ ہو یا ماں کے پیٹ سے گر پڑنے کا کوئی مقام یا بہت اونچے جائے تو زبان و ادب، شعر و شاعری موسیقی و مصوری، تعمیر و صناعی، بت تراشی و بت پرستی وغیرہ کا کوئی روایتی و خرافاتی مجموعہ جس کو تہذیب و تمدن کا لقب دیکر زندگی کا نام کافور رکھدیا جاتا ہے،

ان سب کی مشترک خصوصیت ایک طرف تو یہ ہے کہ بجائے انسان کے اندر کسی باطنی یکرنگی و برتری کو معلوم کرنے کے سارا زور اس کی خارجی و مادی یک رنگیوں اور پستیوں پر دیدیا گیا، دوسری جہت حقوق

ان کا غیر اختیاری ہونا ہے، اگر جو جس رنگ و نسل جس سرزمین یا جس روایاتی و خرافاتی تمدن میں پیدا ہو پڑا تو اب نہ وہ اپنی کھال چھیل کر پھینک دے سکتا ہے کہ کالے سے گورا بن جائے نہ ہندوستان سے ہزاروں میل دور افریقہ میں جا بسنے کے باوجود وہ ہندی کے بجائے فرنگی بن کر فرنگیوں کے مرتبہ و معیار برتری کو حاصل کر سکتا ہے، اس خارجی اور غیر اختیاری معیار کی قدرتی گوناگونیوں کے انسانوں میں باہمی تفریق و امتیاز اور تقسیم در تقسیم کا معیار قرار پا جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کرۂ ارض پر اقوام در اقوام کا ہر چار طرف سے ایک سیلاب ابل پڑا پھر ہر قوم و ملک کے اندر معاشی تقسیمات و طبقات اسی طرح سیاسی جماعات و پارٹیوں کا کھاتا الگ ہے اور ہر چھوٹی بڑی قوم طبقہ و جماعت کا پیش جہاد اپنے لئے زیادہ سے زیادہ مادی منافع کا بٹورنا ہے، لیکن یہ مادی منافع مادی ہونے ہی کی بنا پر محدود بھی ہیں، پٹرول بھی محدود، خام مواد کی پیداوار بھی محدود، مال کی نکاسی کی منڈیاں بھی محدود رہنے بسنے کے لئے نو آبادیاں بھی محدود، اور مطالبہ ہر قوم و جماعت کا نا محدود، اس لئے کہ اسی کا نام ترقی رکھا گیا ہے کہ مادی فوائد کے حصول میں کسی نقطہ پر بھی پہونچ کر قناعت نہ ہو، جس کی صورت یہی ہے کہ جہاں تک بن پڑے ہر ایک دوسرے کے منہ کا نوالہ حلق سے کھینچ لینے کی کوشش کرے، نتیجہ یہ ہے کہ ساری زمین فساد سے بھر گئی، ملک ملک سے، قوم قوم سے، جماعت جماعت سے، طبقہ طبقہ سے برسر پیکار ہے،

اسلام نے ان خود ساختہ مادی و خارجی بنیادوں پر اولاد آدم کی نہ کوئی گروہ بندی تسلیم کی ہے، نہ ان کی بنا پر کسی تفوق و ترجیح کو جائز مانا، نہ مادی منافع کی نا محدود حرص و ہوس کو ترقی قرار دیا، اور گو اب اس قومیت کے منافع و مصالح سے زیادہ مضار و مفاسد کو اسلام کے نہ ماننے والے بھی دل و دماغ سے مانتے جا رہے ہیں، اور بین الاقوامیت و اشتراکیت و اجتماعیت وغیرہ کے راستوں سے ہلاکت سے بچنے کی تدابیر کی جا رہی ہیں، مگر وہی کڑاہی سے بچ کر چولھے میں گرنے کی سب تدبیریں ہیں، مادی و خارجی اغراض و مقاصد کی نا محدود طلب و ہوس کا نصب العین جب تک افراد اور جماعتوں

کے دل و دماغ پر مسلط ہے، اس وقت تک زہر کا نام تریاق رکھ دینے سے ہلاکت سے مفر نہیں، اور نہ حرص و ہوس کا یہ جنون دل و دماغ سے اس وقت تک خارج ہو سکتا ہے، جب تک اسکی جگہ کوئی ایسا عظیم و محکم روحانی و باطنی نصب العین نہ لے لے جس کی عظمت و اہمیت کے سامنے بڑی سے بڑی مادی ترقیاں بھی طفلانہ لہو و لعب معلوم ہونے لگیں، وما الحیٰوۃ الدنیا الا لہو و لعب۔

جمہوریت کا طلسم قومیت سے بھی زیادہ ابلہ فریب و بے حقیقت ہے، بلکہ ایک ایسا اسم ہے جس نے عملاً کبھی اپنے مسمی کی شکل نہیں دیکھی، کسی بڑے پیمانہ پر ملک و حکومت کا کاروبار اس نام نہاد جمہوریت سے چلنا تو درکنار حضرت علیہ الرحمۃ نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "اگر روٹی پکانے میں بھی جمہوریت ہو تو ایک روٹی بھی نہ پک سکے"[1] انگریزی میں بھی مثل ہے کہ "زیادہ باورچیوں میں شوربے کی خرابی لگتی ہے"!

بات یہ ہے کہ جمہوریت و عمومیت وغیرہ کے ناموں سے یہ دعویٰ تو صحیح ہے کہ حکومت عوام کے لئے یعنی ان کی فلاح و بہبود کے لئے ہو لیکن دوسرا دعویٰ کہ حکومت عوام کی ہو یا عوام کی رائے سے ہو، یہ ناقابل عمل ہی نہیں احمقانہ بھی ہے، اس لئے کہ فہم و فکر کے لحاظ سے صد فی صد تعلیم یافتہ ملک کے عوام بھی بہر حال عوام ہی ہوں گے جو اپنے نفع و ضرر کو پوری طرح سوچ سمجھ نہیں سکتے، اور ان کی فلاح و بہبود کو بھی ان کے خواص یا اہل فکر و فہم ہی صحیح طور پر سمجھ اور سمجھا سکتے اور وہی عمل میں لا سکتے ہیں، عوام الناس تو غریب اتنی بھی صلاحیت نہیں رکھتے کہ اپنے خیر خواہ و بدخواہ میں تمیز کر کے اپنے ووٹ تک کا صحیح استعمال کر سکیں، وقت پر اپنی چرب زبانی، چکنی چپڑی باتوں اور جھوٹی سچی ترغیب و تحریص یا چالاکی و مکاری سے ان کا دشمن بھی ان سے ووٹ حاصل کر سکتا ہے اور کر لیتا ہے، پھر ظاہر ہے کہ دنیا میں عقل و فہم کے اعتبار سے اکثریت ہمیشہ کاملین کے مقابلہ میں ناقصین ہی کی رہی ہے، اور رہے گی تو اکثریت کی رائے و انتخاب کے معنی، عقلمندوں کے مقابلہ میں کم عقلوں یا احمقوں کی رائے و انتخاب کے سوا کیا ہے،

---

[1] الافاضات الیومیہ حصہ پنجم ص ۲۵۵،

اور جس طرح لاکھوں کروروں عوام کا حال ہے، اسی طرح ان کی رائے سے منتخب ہوکر جو سینکڑوں ہزاروں خواص کی قانون سازی مجالس یا اسمبلیاں وغیرہ بنتی ہیں اُن میں بھی عقل وفہم، علم وعمل اخلاق و دیانت، اخلاص و بےنفسی کے اعتبار سے نسبتہً کاملین ہمیشہ اقلیت ہی میں ہونگے، اس لئے کسی معاملہ و فیصلہ کو اکثریت کے تابع کرنا در اصل کم عقلوں، کم علموں اور خود غرضوں کے حوالہ کر دینا ہے، اقبال مرحوم پر ہزاروں رحمتیں ہوں حرف بحرف سچ کہا ہے کہ

گریز از طرز جمہوری غلامے پختہ کارے شو　　　کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

صحیح اور فطری اصول یہی ہے کہ سیاسی وغیر سیاسی چھوٹا بڑا کوئی ادارہ ہو دو صد خر کے بجائے بس کسی ایک انسان کو تلاش کرکے اس کے حوالے کر دینا چاہئے، البتہ بڑے سے بڑا انسان بھی زیادہ سے زیادہ عقل و علم، اخلاص و دیانت کی جامعیت کی باوجود فکر و رائے میں غلطی کر سکتا ہے، اس لئے عوام ان سے نہیں بلکہ اہل الرائے سے مشورہ لینا اس پر واجب ہو، تاکہ بحث و گفتگو سے معاملہ کے تمام اطراف و جوانب سامنے آجائیں لیکن نفس مشورہ کے وجوب و پابندی کے باوجود مشورہ لینے اور دینے میں پوری آزادی حاصل ہونی چاہئے کہ مشورہ لینے والا عوام کالانعام کے منتخب کردہ "دو صد خر" کا پابند ہو بلکہ جس معاملہ میں جس وقت جو لوگ بھی اس کو زیادہ اہل الرائے نظر آئیں سب سے مشورہ لینے کے لئے آزاد ہو، اسی طرح مشورہ دینے کے لئے بھی ہر شخص آزاد ہو، یہ نہیں کہ ایک دفعہ الٹا سیدھا اپنا کسی کو نمائندہ منتخب کر دیا تو اب ہم تین یا پانچ برس کی کسی مقررہ مدت تک خود کوئی رائے نہیں دے سکتے، چاہے وہ ہمارا نمائندہ ہوکر ہمارے خلاف ہی رائے دیتا رہے، پس اسلام کی جمہوریت یہی صحیح و متوازن شورائیت ہے، اور فیصلہ بالآخر "دو صد خر" نہیں بلکہ ایک انسان کے ہاتھ میں ہوتا ہے، البتہ وہ اپنی انسانی فکر و فہم کے ساتھ ایمانی فراست اور شرح صدر کی روشنی میں ہوتا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اتنی روشنیوں کے بعد بھی عمل کا قدم محض ناقص انسانی علم و روشنی کے تحت نہیں اٹھاتا کہ انسان کا کامل سے کامل

علم بھی ناقص ہی ہے، نبی کو بھی حکم ہے کہ مشورہ لینے اور اپنی رائے قائم ہوجانے پر بھروسہ عالم کل و قادر کل ذات ہی پر ہے، قرآن مجید نے اپنی موجز و معجز تعبیر کے ایک ہی جملہ میں اسلام کے اجتماعی نظام کار کے اصول ثلاثہ (۱) مشورہ (۲) عزم (۳) اور توکل کو منصوص فرما دیا ہے، کہ شاورهم فی الامر، فاذا عزمت، فتوكل على الله۔

حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے اسکی طرف جا بجا اشارات فرمائے ہیں، مثلاً احکام المال نامی وعظ میں فرماتے ہیں کہ

"قرآن شریف میں مشورے کی تاکید ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کرنا وہی جو اپنی سمجھ میں آجائے، چنانچہ شاورهم فی الامر میں مشورے کا امر بھی ہے، اور آگے یہ بھی کہ فاذا عزمت فتوكل على الله کہ جب خود قصد ہو جائے تو خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرکے کام کو کر ڈالے، یہ نہیں فرمایا کہ فاذا عزموا کہ جب وہ عزم کریں یا فاذا عزم اکثرهم کہ ان میں سے اکثر عزم کریں مطلب یہ کہ مشورہ تو کیجئے، اور مشورے کے بعد جس بات پر خود آپ کی رائے قرار پائے وہ کیجئے،

یہاں سے جمہوری سلطنت کا قلع قمع ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جدھر کی کثرت رائے ہو اس جانب کو لیا جائے، سو قرآن شریف کی تعلیم اس کے خلاف ہے، اس میں فاذا عزم اکثرهم نہیں فرمایا، بلکہ فاذا عزمت فرمایا، خلاصہ یہ ہے کہ مشورہ تو سب کا ہو اور عزم آپ کا ہو، دوسروں کی رائے پر عمل کرنا لازم نہیں، اگرچہ وہ اہل ہی ہوں، اور آج کل کے تو اہل الرائے ماشاء اللہ اہل بھی نہیں ہوتے...... کمیٹیوں میں ایسے ایسے ممبر ہوتے ہیں، جن کو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہوتی، واقعات بتلا رہے ہیں کہ آج کل کی کثرت رائے بالکل ہی مہمل ہے (ص۵۳ تا ص۵۵)"

حضرت کو تو الحمد للہ کہ اس مہمل کثرت رائے سے سابقہ شاید ہی کبھی ہوا ہو، راقم ہذا کو آج کل کی کمیٹیوں اور ان کی اکثریت کا کچھ تھوڑا تجربہ ہوا تو بس اکثر اس اکثریت میں "دو صد خر" کا منظر ہی دیکھا اور بالآخر

اس سے طبیعت میں اتنی کراہیت پیدا ہو گئی کہ کسی کام میں جہاں کمیٹی کا نام آیا کہ ذہنی متلی شروع ہو گئی[1]
خالص عقلی راہ سے بھی دیکھئے تو اجتماع کا نفسیاتی لازمہ یہ ہے کہ جو جماعت جتنی کثیر ہو گی، اسی نسبت سے
اس کے افراد کی انفرادی عقل بھی قلیل ہوتی جائے گی،

حریت یا آزادی کا ڈھول سب سے زیادہ پیٹا جاتا ہے، لیکن اسلامی حریت و آزادی کے مقابلہ میں
اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ آزادی نام ہے آقاؤں کی صرف تبدیلی کا، کہ ہم فلاں رنگ و نسل یا فلاں ملک
و سرزمین کے انسانوں کی غلامی قبول نہ کریں گے، ان کے بجائے ہم کو ایسے آقا درکار ہیں جو ہمارے ہی
رنگ روپ یا ہمارے پاس پڑوس کے ہوں، بس یہ ملکی و قومی آزادی کی پرواز ہے، یا پھر خود اپنے
ملک و قوم میں آزادی یہ ہے، کہ اپنی غلامی کے لئے کسی فرد یا جماعت کو ہم خود اپنا آقا منتخب کریں، بخلاف
اس کے اسلام کی عطا کردہ حقیقی آزادی یہ ہے کہ وہ انسان پر انسان کے حکم و حکومت کا قطعاً روادار نہیں، نہ
اپنوں کی نہ پرایوں کی، نہ ملکیوں کی نہ آفاقیوں کی نہ فرد کی نہ جماعت کی حتی کہ وہ کسی شخص کو خود اپنا یا اپنے
نفس و ہوا کا محکوم و تابع رکھنا بھی گوارا نہیں کرتا[2]، ان الحکم الا للہ[3]

فرد و جماعت، ملک و قوم سب کا حاکم بالا دست یا آقا و مالک صرف وہی ہو سکتا ہے جو واقع
کے لحاظ سے بھی ان کا مالک و خالق ہے یا پھر وہی جس کو جس درجہ میں اپنے ملک اور اپنی سلطنت میں
اپنا کارندہ تجویز کر دے باقی اپنے ذاتی اختیار سے نہ کسی فرد کو نہ کسی جماعت کو نہ اپنے اوپر کسی طرح کی
سرداری و سرداری کا حق حاصل ہے، نہ دوسروں پر نہ خود ساختہ قومی و ملکی تجارتی و تمدنی اغراض و
مقاصد کے لئے کسی ملک و سرزمین کے لینے دینے یا تقسیم کرنے کا حق نہ محض اپنی رائے و عقل سے خود اپنے

---

[1] لیکن اس سلسلہ میں جمہوری حکومتوں نیز ان کے ہاں کے جمہوری اداروں کے تجربات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ (عبد الماجد)
[2] اس عبارت کو ذرا محدود و مقید کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ امامت اور اقتدا، امر اور اطاعت پر تو اسلام کیا ساری اجتماعی زندگی ہی کا مدار ہے (عبد الماجد)
[3] یہ لفظ قرآن مجید میں جہاں جہاں اور جس سیاق میں آئے ہیں وہ اس دعویٰ کی تائید میں نہیں، (عبد الماجد)

یا غیروں کے لئے کسی فرد یا جماعت کو کوئی قانون وضع کرنے کی اجازت، خدا کی زمین پر صرف خدا ہی کا اتارا ہوا
قانون چلنا چلانا چاہئے، جو ایسا نہیں کرتے قرآن کا اعلان ہے کہ وہی کافر، ظالم، فاسق، سب کچھ ہیں[4]
من لم یحکم بما انزل اللہ او لئک هم الکافرون ـ هم الظالمون، هم الفاسقون،

مساوات کے دعوی کا یہی حال ہے، کہ اسلامی اعتقاد پر مبنی اخوت کے بغیر یہ عملاً ایک محال فطری
کا دعوی ہے، خدا کے سوا انسان کسی معنی میں بھی اپنے کو کسی دوسرے انسان کا تابع و محتاج مان کر یا اس کے
قبضہ میں اپنا نفع و ضرر جان کر بھلا اس کے آگے بندگی و سرافگندگی سے کیسے رک سکتا ہے، پھر اس بندگی
و سرافگندگی کے بعد مساوات کہاں، توحید کی بصیرت و اخوت نصیب نہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ آدمی
آدمی کے آگے جھکتا ہے، "آدم از بے بصری بندگی آدم کرد" جو کتے بھی نہیں کرتے، "من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد"
حقیقی حریت و اخوت اسی کا حصہ ہو سکتا ہے جس کے دل نے لا الہ الا اللہ کا راز پالیا،

مرد حر از لا الہ روشن ضمیر   می نگردد بندۂ سلطان و وزیر

پھر اسلام کی اصل روح سمع و اطاعت ہے اور قومی و سیاسی تحریکات کا سب سے بڑا سرمایہ انقلاب
و بغاوت، اگر بیرونی حکومت سے آزادی ہے، تو خود اپنی ہی حکومت کے خلاف کوئی نہ کوئی شکایت پیدا
ہوتے رہنا لازم، ایک پارٹی کی وزارت ہے تو دوسری اس کے لئے ہر وقت عدم اعتماد کی تحریک کا علم بجاو
لئے کھڑی ہے، رعایا و عوام کی فلاح و بہبود سے زیادہ اپنی پارٹی کی وزارت کے قیام اور مخالف کے انہدام
کی فکر، حکومتی و سیاسی ملکی و قومی تجارتی و صنعتی کسی ادارہ یا فرد و جماعت سے کوئی شکایت ہو تو احتجاج ہے
ہڑتال ہے، جلسے ہیں، جلوس ہیں، نعرے ہیں، جن میں کشت و خون تک کی نوبت! اور یہ کیوں نہ ہو اس لئے

---

[1] ان سب عبارتوں کو محدود اور مقید کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ مطلق صورت میں تو ہر عقل اور ہر تجربہ سے انکار لازم آئیگا، حالانکہ یہ عقل اور تجربے بھی اللہ ہی کے عطیے ہیں، (عبد الماجد)
[2] یہ سب وعیدیں صرف ان لوگوں کے حق میں وارد ہوئی ہیں، جو خدا کی ہدایات و احکام کے موجود ہوتے ہوئے انہیں چھوڑ کر ہوائے نفس کے ماتحت قانون بنا رہے ہیں، (عبد الماجد)

کہ حق و انصاف کا اور کوئی ترازو ہی نہیں، تعلیم یہ ہے کہ جس قدر زیادہ شور و غل مچاؤ اور ہنگامہ فساد برپا کرو اُسی قدر زیادہ تمہارا حق زوردار سمجھا جائیگا، جتنے زیادہ زور سے پیٹ پیٹو گے اتنے ہی بھوکے سمجھے جاؤگے اور اتنا ہی زیادہ پاؤگے' لاحول ولا قوۃ یہ بھی کوئی نظام حکومت و سیاست ہے؟ جس کی بدولت ملک بھر میں روزانہ طرح طرح کے ہنگامے اور فسادات کھڑے رہیں اور شہریوں کا امن و امان برباد ہوتا رہے، رعایا حکومت سے برسر پیکار رہے، مزدور کارخانہ دار کے خلاف شورش برپا کر رہے ہیں، کاشتکار زمیندار پر دانت نکالے ہیں، کیونکہ اس کے بغیر کوئی زبردست زیردست کے ساتھ حق و انصاف پر آمادہ نہیں! جس نظام جماعت کی بنا حقوق شناسی کے بجائے حقوق طلبی پر ہو وہاں ہر چہار طرف سے دن رات مطالبات و احتجاجات کی شورشوں اور شوریدہ سریوں کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے، اسلام نے انقلاب و بغاوت کی اجازت بہت ہی انتہائی حالتوں میں دی ہے کہ نسبتہً اور قابل تحمل حد تک بُری حکومت کے تحمل کر لینے میں اتنا ضرر نہیں، جتنا روز روز کے انقلاب حکومت شور و شر اور فتنہ و فساد میں، اس لئے کہ اسلام کی نگاہ میں محض یہی زندگی اور اسی کا ٹھاٹ نہیں ہے، یہ انسانی زندگی کا بہت ہی حقیر و فانی جزو ہے، اسلام کے پیش نظر تو اصلاً انسان کی اعلیٰ اور غیر فانی زندگی کی فلاح ہے، اور فکر و عمل کی مشغولیت کا وہی اصل میدان ہے، باقی یہ دنیا خود فانی و ناقص ہے اور اس کی ہر چیز فانی و ناقص ہی رہے گی، تم لاکھ جد و جہد کرو لیکن نہ اس کی سیاسیات کو کامل و بے عیب بنا سکتے ہو، نہ اس کی قومیات و معاشیات کو، بلکہ اس کی ساخت تو کچھ ایسی ہے کہ ایک طرف سے کسی نقص کو دور کرو تو دوسری طرف سے اس کے ردعمل کا فساد اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اس کے بناؤ بگاڑ میں دن رات لگے رہنا ایسا ہی ہے جیسے بچوں کو دن رات کھیل کود اور اس کے لئے لڑائی جھگڑوں میں لگا رکھا جائے، اور جوانی یا مستقبل کی دیرپا زندگی کے لئے تیاری کی ان کو مہلت ہی نہ ملے، اسلام نے اپنی تعلیمات میں حقوق طلبی کے حریصانہ و حریفانہ جذبات کو نہیں اُبھارا کہ یہ تو فساد فی الارض کا سرچشمہ ہے، بلکہ حقوق شناسی

اور ادائے فرض پر زیادہ زور دیا ہے، وہاں کسی حق کی طلب کے لئے حلق کا زور لگانے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے، جہاں ایسے حقوق تک کے ادا کرنے کی تاکید و حکم ہو جن کی خود صاحب حق کو خبر تک نہیں، اسلام کی اس حقوق شناسی اور آج کل کی حقوق طلبی کے اسی فرق کو ایک موقع پر حضرت مجدد علیہ الرحمۃ واضح فرماتے ہیں:۔

"آج کل جو محکوم حاکم کا مقابلہ کر کے سختی کے ساتھ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگے تو اس کو کچھ حق مل جاتا ہے، یوں کہئے کہ آج کل کے اہل حکومت یہ چاہتے ہیں کہ جب تک محکوم محکوم بن کر رہے اُس وقت تک اس کو حقوق نہ دیئے جائیں، ہاں جب وقت محکوم حاکم بن کر یا کم از کم مساوی بنکر اپنے حق کا مطالبہ کرنے لگے، اسی دن سے اس کو حقوق ادا ہونے لگیں، بس وہی مثل کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس، لاٹھی کے بغیر اپنی بھینس بھی نہیں مل سکتی، اور لاٹھی جو پرائی بھی ہانک لیجائے، مگر شریعت میں معاملہ برعکس ہے، اور ایسے مردہ حقوق کے ادا کرنے کی زیادہ تاکید ہے، جن کا کوئی مطالبہ کرنے والا نہیں، حدیث میں ہے کہ جس حق کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، حتیٰ کہ صاحب حق بھی نہیں جانتا، ایسے حقوق کا خدا تعالیٰ خود حساب و مطالبہ فرمائیں گے"۔

مسلمانوں کے دینی و ایمانی ضعف و اضمحلال کے اس گئے گذرے زمانے میں بھی اس کی مثالیں بالکل نایاب نہیں، ایک مرد مومن کا خود راقم ہذا کے ساتھ ایک معاملہ پیش آیا کہ راقم کے ددھیال قصبہ امیٹھی میں اس کا پشتہا پشت پہلے کا ایک مشترک سکنہ تھا جس پر بہت ہی پرانا املی کا ایک درخت تھا، جس کے متعلق گھر میں کبھی صرف اتنا سنا تھا کہ دادی مرحومہ اپنی زندگی تک اس کی املی کا اپنا حصہ سالانہ ضرور وصول فرمایا کرتی تھیں، ان کی وفات کے بعد نہ وہاں کے تعلقات رہے نہ اس درخت کے متعلق کسی کو کوئی وہم و خیال تھا، لیکن راقم کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسی سکنہ کے ایک خاندانی شریک و رئیس[1] نے غالباً ۳۵ء لکھا ہے کہ وہ املی گر گئی تھی کوئلہ بنا کر فروخت ہوا، اس کا حصہ ہے، راقم کو بھی مناسخہ کرا کے خاندان کے وارثوں تک آنے پائی سے ان کا حصہ پہنچانے کی سعادت نصیب ہوئی، فالحمد للہ،

---

[1] قاضی خادم حسین صاحب وکیل و رئیس امیٹھی ضلع لکھنؤ،

اللہ اکبر جب ہماری اس گئی گذری حالت میں ایسی مثالیں مفقود نہیں، تو خیر القرون اور صحابہ و تابعین کا ذکر نہیں، جب تک مسلمان اپنے ایمان وعمل میں مسلمان رہے ہوں گے کیا حال رہا ہوگا، اور آج بھی دنیا اگر محض مادی وخارجی انقلاب پر سارا زور لگانے کے بجائے اسلامی تعلیمات کا یہ روحانی و باطنی انقلاب کسی درجہ میں بھی پیدا اور قبول کرے تو دنیا بھر میں روز روز کے جنگ و جدل، فتنہ و فساد، اور کشت و خون کا کتنا سد باب ہو جائے، اور ظاہری دنیا کے امن و امان کے ساتھ قلوب کی باطنی دنیا کو بھی کتنا سکون و اطمینان نصیب ہو، جس دولت سے شاید اب ہزاروں لاکھوں ہی میں کوئی قلب آشنا رہ گیا ہو، ایک معمولی سی بات ہے کہ اب عام طور سے کسی سے کوئی معاملہ کرنے یا کچھ قرض تک دینے میں یہی ڈر لگتا ہے، کہ خدا جانے کیا دھوکا دیدے اور لینے والا دینے کے بجائے بالعموم مار لینے ہی کی فکر میں رہتا ہے انا للہ، دنیا ہی میں انسان کو قلب و دماغ کی کس بے اطمینانی و بے اعتمادی کی جہنم میں ڈھکیل دیا گیا ہے! اسلامی شریعت کا ایک معمولی قانون یہ ہے کہ مبیع میں اگر کوئی عیب ہو تو بائع کا فرض ہے کہ خود ہی مشتری کو اس سے آگاہ کر دے، آج کل معاملہ بالکل برعکس ہوتا ہے، کہ مشتری کو کسی نہ کسی طرح پھنسا لینا ہی بڑا کمال ہے،

بہرحال یہ تو ہماری موجودہ قومیات و سیاسیات کے وہ چھوٹے اور جعلی سکے تھے، جنھوں نے انسانیت کے سارے بازار کو گندہ اور پراگندہ کر رکھا ہے، لیکن ان سب کی جڑ قرآن کی اصطلاح میں علو فی الارض کا ارادہ یا نصب العین ہے، بلکہ یہی ساری قومی و سیاسی تحریکات حاضرہ کا لفظی ترجمہ ہے جو دوسرے لفظوں میں نام ہی ہے فساد فی الارض کا، اور کبھی مصر کے ایک فرعون نے علو فی الارض (ان فرعون علا فی الارض) سے زمین مصر میں فساد بپا کیا تھا، تو آج قومیات و سیاسیات کی راہ سے کرۂ ارض کے چپہ چپہ پر چھوٹے بڑے فرعونوں نے اسی علو طلبی کا فساد مچا رکھا ہے، ادنیٰ ادنیٰ ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی، چھوٹے سے چھوٹے سرکاری و غیر سرکاری، سیاسی و غیر سیاسی، قومی و تعلیمی اداروں کی ممبریوں اور صدارتوں سے لے کر بڑی سے بڑی حکومتوں اور ملکوں تک کے ادنیٰ سے اعلیٰ حکومتی و غیر حکومتی، قومی و غیر قومی، اعزازی

و تنخواہی منصبوں، عہدوں اور لیڈریوں یا قومی و ملکی آزادی و خود مختاری سب کی طلب کا حاصل وہی اپنی ذات یا ملک و قوم کے لئے مالی و جاہی سروری یا سربلندی یا علو و کبریائی کی طلب کے سوا کیا ہے، یعنی لے دیکر اسی فانی دنیا اور اسی فانی زندگی کے ظاہری و مادی منافع!

بھلا اسلامی قومیات و سیاسیات کو اس پستی و پست نظری اور دل و دماغ کی اس درجہ دنارت و خست سے دور کا بھی کوئی واسطہ ہو سکتا ہے؟ وہاں اپنے حق و استحقاق لیاقت و اہلیت کے لمبے لمبے قصیدے شائع کرنا کیا معنی! کسی جاہ و منصب کی طلب و خواہش کا زبان تک آجانا بھی اس کے لئے نالائقی اور نااہلی کی اولین دلیل ہے، اس کی انفرادی و اجتماعی، سیاسی و قومی، علمی و تعلیمی ہر حرکت و جنبش کا مدعا صرف حق اور کلمۂ حق کا علو و اعلا ہے، نہ اپنی ذات کے لئے کسی علو و سربلندی کا ارادہ جائز ہے، نہ اپنی قوم و وطن کیلئے، نہ اپنی نسل و رنگ کے لئے، نہ اپنی تجارت و صنعت کے لئے اور نہ کسی خود ساختہ تہذیب و تمدن یا نام نہاد ثقافت کے لئے اور نہ کسی ہوائی یا نفسانی نظریہ و خیال کے لئے، ان چیزوں کا تو اگر ذہن میں خیال بھی شریک ہو گیا تو شرک ہو گیا، اور مسلمان خالص کلمۂ حق کے علو و اعلاء کے مقام توحید سے گر گیا، حتیٰ کہ حکومت و سلطنت بھی جو کسی دنیوی جاہی و مالی سروری و سربلندی کی نیت و ارادہ سے اور خدا کی نافرمانی و ناراضی کی راہ سے حاصل کی جائے تو اسلام کی نگاہ میں اس کے مقابلہ میں خدا کو راضی رکھ کر "پاخانہ اٹھانا" ہزار درجہ بہتر ہے، اگر سلطنت سلطنت ہی کے لئے دین و اسلام کا بھی مقصود ہے تو یہ تو فرعون، شداد و نمرود سب ہی کو حاصل تھی، پھر کیا اسلام بھی اسی فرعونیت کی از سر نو دعوت دینے آیا ہے! اسی حقیقت کی طرف حضرت مجدد وقت کس ایمانی قوت و حرارت کے ساتھ متوجہ فرماتے ہیں کہ

"خدا کی قسم اگر ہم کو پاخانہ بھی اٹھانا پڑے اور خدا ہم سے راضی ہو تو وہی ہمارے لئے سلطنت ہے، اور اگر خدا راضی نہ ہو تو لعنت ہے ایسی سلطنت پر جو خدا کو ناراض کر کے حاصل کی جائے، یاد رکھو کہ سلطنت کوئی تقرب الی اللہ کا سبب نہیں، بعض انبیاء علیہم السلام ایسے بھی ہوئے ہیں جن کو

ساری عمر سلطنت نصیب نہیں ہوئی، حدیث میں آیا ہے کہ ایک نبی کے ساتھ صرف ایک آدمی ہوگا اور بعض کے ساتھ ایک بھی نہ ہوگا، تو کیا سلطنت نہ ہونے سے ان انبیاء کے درجے میں کوئی کمی آگئی، اگر محض سلطنت کوئی قرب کی چیز ہوتی، تو فرعون کو بڑا مقرب ہونا چاہئے۔"

علم و فضل، تقویٰ و طہارت، شہرت و عظمت، ہر اعتبار سے اس وقت جو دو بڑے علمائے دین سیاسیات حاضرہ میں سب سے پیش پیش ہیں، راقم ہذا کو لکھنؤ اسٹیشن پر ایک دفعہ دونوں کی ایک ساتھ زیارت نصیب ہوئی، تو بعینہ اپنا یہی خلجان ان کی خدمات میں پیش کیا کہ فرض فرمایئے کہ ایک طرف مسلمان محکوم و محتاج، مفلس و جاہل سب کچھ ہیں، لیکن دین و ایمان کے ساتھ مرتے ہیں، اور دوسری طرف حکومت و دولت، جاہ و ثروت، علم و عزت سب کچھ حاصل ہے، لیکن دین و ایمان برائے نام یا خطرہ میں ہے، تو دینی و اسلامی نقطۂ نظر سے مہلک حالت کون سی ہے؟ اور اہم و اقدم فکر دین و ایمان کی ہے یا حریت و حکومت کی!

غرض مسلمان اگر مسلمان ہے تو اس کی نگاہ میں حکومت و سلطنت سب سے مقدم آخرت ہی ہوگی اور آخرت انہی کے لئے ہے کہ جو زمین میں علو یا تفوق و برتری، سرداری و سربلندی اور فتنہ و فساد کا ارادہ نہیں رکھتے، تلک الدار الآخرۃ نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض و لا فسادا

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی ۔ بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

قومیت و وطنیت، جمہوریت و اکثریت، انقلاب و بغاوت، مساوات و حریت وغیرہ یہ تو وہ گندگیاں تھیں جو آج کل کی قومیات و سیاسیات کے شجرۂ خبیثہ کی جڑوں میں پیوست ہیں، پھر اس کے برگ و بار کا کہنا ہی کیا، کذب و افترا، جعل و فریب، سازش و دغا، بغض و حسد، سب و شتم، توہین و تذلیل، غیبت و بہتان کونسا بڑا چھوٹا گناہ ہے، جو انتخابات کے ہنگاموں، جلسوں کے پنڈالوں اور اخباروں کے کالموں میں عین ثواب نہیں!

یادش بخیر! یہ اخبارات اور ان کا جھوٹ سچ پروپگنڈا جو آج قومیات و سیاسیات کے بال و پر ہیں

اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو ایسے اخبارات سراسر منبع شر و فساد اور ان کا نکالنا اور پڑھنا سب ناجائز و حرام۔ لیکن اس حرمت و عدم جواز کا نام بھی کون لے سکتا تھا، تاہم وقت کے مجدد کی نظر و ہمت اتنے بڑے مفسدہ پر تنبیہ اور اس کی اصلاح سے کیسے باز رکھ سکتی تھی، پہلے اس پر ایک چھوٹا سا مستقل رسالہ تحریر فرمایا، اور پھر لوگوں کے شور و غل پر بقدر ضرورت زبانی و تحریری تشریح بھی فرمائی، مخالف کی توہین و تذلیل، صریح بہتان و افترا کا ذکر ہی کیا، ایک عام اخباری مفسدہ و معصیت یہ ہے کہ ہر خبر کو بلا کافی تحقیق و توثیق کے شائع کر دیتے ہیں، خصوصاً اگر وہ ان کے مفید مطلب یا ان کے اخبار کی پالیسی کے موافق ہو، اس کی مذمت جیسا کہ حضرت علیہ الرحمہ نے فرمایا خود قرآن مجید کی اس آیت سے ثابت ہے کہ

"واذا جاءهم امر من الامن او الخوف الی قوله یستنبطونه منهم

یعنی جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہونچتی ہے، خواہ وہ موجب امن ہو یا موجب خوف ہو تو اسکو فوراً مشہور کر دیتے ہیں (اس میں ایسے اخبار اور ایسے جلسے بھی آگئے) حالانکہ کبھی وہ خبر غلط ہوتی ہے اور کبھی اس کا مشہور کرنا خلاف مصلحت ہوتا ہے) اور اگر یہ لوگ اس خبر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں اُن کی رائے پر حوالہ رکھتے تو وہ حضرات اس کی حقیقت کو پہچان لیتے، جو ان میں تحقیق کر لیا کرتے ہیں۔"

آگے جو اصلاحی ہدایات فرمائی ہیں اُن میں سے بعض مختصر یہ ہیں،

(۱) جو واقعہ کسی کی مذمت و معائب پر مشتمل ہو، اس کو اس وقت تک ہرگز شائع نہ کیا جائے جب تک حجت شرعیہ سے اس کا کافی ثبوت نہ مل جائے، کیونکہ جھوٹا الزام لگانا کافر پر بھی جائز نہیں، لیکن آج کل اخبارات کا شاید کوئی صفحہ اس سے خالی ہوتا ہو،

(۲) یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ حجت شرعیہ کے لئے کسی افواہ کا عام ہونا یا کسی اخبار کا لکھ دینا ہرگز کافی نہیں، بلکہ شرعی شہادت ضروری ہے،

(۳) کسی شخص کے عیب یا گناہ کا واقعہ اگر حجت شرعیہ سے بھی ثابت ہو جائے تب بھی اس کی اشاعت اور اخبار میں درج کرنا جائز نہیں، بلکہ فرض یہ ہے کہ خیر خواہی سے تنہائی میں اس کو سمجھایا جائے، کیونکہ اس کو رسوا کرنا علاوہ شرعی ممانعت کے تجربہ سے ثابت ہے کہ بجائے مفید ہونے کے ہمیشہ مضر ہوتا ہے،

(۴) البتہ اگر کسی مسلمان کا عیب یا گناہ شرعی حجت سے ثابت ہو اور اس کا نقصان یا ظلم اپنی ذات کو پہنچتا ہو تو پھر اس کی بُرائی کو علانیہ شائع کر سکتا ہے کہ لا یحب اللّٰہ الجھر بالسوء الا من ظلم یعنی اللہ تعالیٰ بُرائی کے اعلان کو پسند نہیں فرماتے مگر جس پر ظلم کیا گیا ہو ..... لیکن اس صورت میں بھی تجربہ یہ ہے کہ عام اعلان و اشاعت کے بجائے صرف ان لوگوں کے سامنے بیان کرے جو دادرسی کر سکیں،

(۵) جو خبر کسی کی مذمت و ضرر پر مشتمل نہ ہو اس کی اشاعت جائز ہے، مگر اس شرط سے کہ کسی مسلمان کی خاص مصلحت یا عام مصلحت کے خلاف نہ ہو، اور جس میں ایسا احتمال ضعیف بھی ہو تو بجز ان لوگوں کے جو عقل و شرع کے موافق اس معاملہ کو ہاتھ میں لئے ہوں، عام لوگوں پر اس کو ظاہر نہ کرنا چاہئے،

(۶) خلاف شرع مضامین اور ملحدین کے عقائد باطلہ اول تو شائع نہ کئے جائیں اور اگر کسی ضرورت سے اشاعت کی نوبت آئے تو جس پرچہ میں شائع ہوں اُسی میں تردید اور کافی جواب بھی شائع ہو، کیونکہ بہت سے آدمی وہ ہوتے ہیں، کہ جن کی نظر سے آئندہ پرچے نہیں گذرتے، خدانخواستہ اگر وہ اس سے کسی شبہہ میں گرفتار ہو گئے تو اس کا سبب شائع کرنے والا ہو گا،

(۷) اگر مسلمانوں پر کافروں کے ظلم کی خبر شائع کرنا ہو تو جبتک اس ظلم کی نسبت کافروں کی طرف حجۃ شرعیہ سے ثابت نہ ہو، اس طرح شائع کیا جاوے کہ فلاں مقام کے مسلمانوں پر مظالم ہو رہے ہیں، مسلمان ان کا انسداد کریں اور جائز طور پر ان کی جانی و مالی امداد کریں،

(۸) اخبار کا اڈیٹر ہمیشہ ایسا شخص بنے جو تمام علوم اسلامیہ پر عبور رکھتا ہو، یا کم از کم علماء سے رجوع کرنے کا پابند ہو، ورنہ ظاہر ہے کہ اخبار کی اشاعت بیدینی و بے قیدی کا ایک کامیاب آلہ ہے،

(۹) ایسی کتاب کا جو دین کو مضر ہو یا ایسی دوا کا جو شرعاً حرام ہو یا کسی ایسے معاملہ کا جو شرعاً فاسد ہو اشتہار نہ دیا جائے، اور نہ اخبار میں تصویر بنائی جائے،

ظاہر ہے کہ اس دور میں ان ہدایات پر عمل کرنا تو الگ رہا ان کو سننے کی برداشت بھی کتنے کانوں کو ہوگی، تاہم اتمام حجت کے لئے تجدید و اصلاح کا جو فرض تھا وہ حضرت مجددؒ نے اس معاملہ میں بے تکلف ادا فرما دیا، خود فرماتے ہیں کہ

"یہ مختصر گذارش محض دل سوزی و ہمدردی پر مبنی ہے، اگرچہ زمانہ کی مسموم ہوا میں کارگر ہونے کی توقع نہیں لیکن بایں امید کہ شاید خدا تعالیٰ کسی نیک بندہ کو عمل و اصلاح کی توفیق عطا فرمائیں، یہ سب عرض کر دیا گیا، وللّٰہ الحمد" (ص ۸۱۶ تا ص ۸۲۱)

سوچنے کی بات ہے کہ اگر ایک اخبارات اور پروپگنڈے ہی کے معاملہ میں اسلامی تعلیمات و ہدایات کے حدود و قیود کو محفوظ رکھا جاتا تو روزمرہ کی باہمی تلخیوں اور سیاسی شر و فساد کا کتنا باب بند ہو جاتا، اور غیروں پر بھی اس کا کتنا اثر ہوتا کہ مسلمان دشمنی میں بھی کتنا حد و دشناس اور احتیاط پسند ہوتا ہے، (باقی)

فتاوی عالمگیری اور اُسکے مؤلفین

جناب حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

عرب جہاں بھی گئے اپنے ساتھ اسلامی علوم و فنون، تہذیب و معاشرت بھی لے گئے، یہی وجہ ہے کہ ایشیا، یورپ اور افریقہ جس سرزمین میں انھوں نے قدم رکھا وہاں کے مذہب کے ساتھ ساتھ تہذیب، معاشرت اور زبان کو بھی بدل دیا، اس کے برخلاف ترک و تاتار اور دوسری عجمی مسلمان قومیں جہاں گئیں ان کا مذہب تو اسلام رہا، لیکن تمدن انھوں نے اپنا پھیلایا، اسی لئے شام مصر و شمالی افریقہ کے مقابلہ میں ہندوستان میں عجمی تمدن اور عجمی مذاق کو زیادہ فروغ ہوا،

ہندوستان میں اگرچہ صدیوں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی، لیکن اس کے تمام حکمراں خانوادے اور ان کے بیشتر عمال حکومت عجمی تھے، اس لئے ان کے اثر سے یہاں زیادہ تر عقلی و عجمی علوم کا چرچا رہا اور ان کے مقابلہ میں خالص دینی علوم تفسیر و حدیث و رجال و طبقات کی خدمت و اشاعت کم ہوئی تاہم ہر زمانہ کے اکابر علماء اپنے طور پر اس فرض کو انجام دیتے رہے، اور دینی علوم کی خدمت میں دوسرے اسلامی ممالک سے ہندوستان کا قدم بہت پیچھے نہیں رہا، لیکن حکومت کے بیشتر قوانین اسلامی تھے، خصوصاً مسلمانوں کی روزانہ زندگی کے معاملات و معاشرتی مسائل کا تعلق فقہ سے تھا، اس لئے ہر دور میں فقہ کی جانب خاص توجہ رہی اور فقہ کی کتابوں پر شروح و حواشی لکھے گئے، مطولات کے مختصرات کئے گئے، فقہ و فتاوی کی متعدد اہم کتابیں فتاوی تاتارخانیہ[1]، فتاوی حمادیہ[2] اور فتاوی ابراہیمیہ[3] تالیف ہوئیں، اورنگ زیب علیہ الرحمہ نے فتاوی عالمگیری مدون کرائی جو ہندوستان کا قابل فخر

[1] مؤلفہ عالم بن العلاء متوفی ۷۸۶ھ [2] مؤلفہ ابو الفتح رکن بن حسام ناگوری [3] مؤلفہ قاضی نظام الدین متوفی

کارنامہ اور گذشتہ فتاوی کی کتابوں میں سب سے مقدم و ممتاز ہے، اول الذکر فتاوی افراد کی تالیف تھے، اور فتاوی عالمگیری گیارھویں صدی ہجری کے پورے ہندوستان کے منتخب علماء کی کوششوں کا نتیجہ ہے، اسی لئے اس میں جو جامعیت اور جزئیات کا جس قدر استقصاء ہے، وہ دوسرے فتاوی میں نہیں ہے اور اس کو گذشتہ فتاوی میں خاص اہمیت حاصل ہے، لیکن تعجب ہے کہ اب تک نہ عالمگیری کے مؤلفین کے حالات یکجا جمع کئے گئے اور نہ تو اس کی خصوصیات اور ماخذ پر کچھ لکھا گیا، اس مضمون میں اس کمی کو پورا کرنا مقصود ہے:

(۱) فتاوی عالمگیری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی ایک شخص کی تالیف نہیں بلکہ علماء کی ایک ممتاز جماعت کی تالیف ہے، اس لئے وہ ان نقائص اور فروگذاشتوں سے پاک ہے، جن کا ایک فرد واحد کی تالیف میں امکان رہتا ہے،

(۲) اس میں وہی مسائل لئے گئے ہیں جو راجح، مفتی بہ یا ظاہر الروایت[1] کے ہیں اگر کوئی مسئلہ ظاہر الروایت میں نہیں ہے تو نوادر سے لے لیا گیا ہے، لیکن اس تصریح کے ساتھ کہ کتاب میں اس پر فتوی کا اشارہ موجود ہے،

(۳) ہر مسئلہ کے ساتھ اس کے ماخذ کا مفصل حوالہ بھی دے دیا ہے، جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے، اگر اس میں کسی دوسری کتاب سے نقل کیا گیا ہے تو ناقلاً عن فلاں کر کے اصل ماخذ کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے،

(۴) اگر کسی مسئلہ کے بارہ میں دو مختلف اقوال ہیں اور دونوں میں سے کوئی قابل ترجیح نہیں ہے تو دونوں کو مع حوالہ نقل کر دیا گیا ہے، اگر کسی کتاب کی لفظ بلفظ نقل ہے، تو کذا لکھ دیا ہے، اور اگر اس کا خلاصہ اور مفہوم لے لیا ہے تو ہکذا سے اشارہ کر دیا گیا ہے،

(۵) یہ کتاب تقریباً آٹھ برس میں تیار ہوئی اور کم و بیش دو لاکھ روپئے اس پر صرف ہوئے،

[1] چھ کتابیں ظاہر الروایت میں شمار کی جاتی ہیں، جامع کبیر، جامع صغیر، مبسوط، زیادات، السیر الکبیر، السیر الصغیر،

عالمگیری کے مآخذ: فتاویٰ عالمگیری فقہ کی تمام اہم اور معتبر کتابوں کا خلاصہ اور عطر ہے، ذیل میں عالمگیری کے تمام مآخذ کی فہرست دیجاتی ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ علماء نے کس جانکاہی سے سینکڑوں خرمنوں سے خوشہ چینی کرکے فقہ و فتاویٰ کا یہ ذخیرہ جمع کیا ہے،

(۱) ہدایہ ص۳ برہان الدین المرغینانی (۲) شرح طحاوی ص۳ غالباً امام بدر الدین العینی کی شرح مراد ہے (۳) ذخیرۃ العقبیٰ ص۳ شرح منیۃ المصلی (۴) مضمرات ص۳ قدوری کی شرح اس کا دوسرا نام جامع المضمرات ہے، (۵) البدائع ص۳ (۶) المغنی ص۳ (۷) عینی شرح ہدایہ ص (۸) الخلاصۃ ص (۹) فرائض الزاہدی ص، ابوالرجاء مختار بن محمود م ۶۵۸ھ (۱۰) ظہیریہ ص ظہیر الدین البخاری م ۶۱۹ھ (۱۱) محیط ص اس نام کی دو کتابیں ہیں ایک برہان الدین صدر الشریعۃ کی تصنیف ہے جو المحیط البرہانی کے نام سے موسوم ہے، اور دوسری رضی الدین السرخسی کی جو محیط السرخسی کے نام سے مشہور ہے، ثانی الذکر کے بعض نسخے مصر وغیرہ کے کتبخانوں میں موجود ہیں، غالباً عالمگیر کے شاہی کتب خانہ میں بھی اس کا کوئی نسخہ موجود تھا، الفوائد البہیۃ میں مولانا عبدالحی نے لکھا ہے کہ اس کے بعض نسخے میری نظر سے گذرے ہیں (۱۲) طحاوی (۱۳) فتاویٰ قاضی خاں ص (۱۴) شرح وقایہ ص (۱۵) التبیین ص امام نسفی (۱۶) محیطین ص شاید اس سے مراد محیط برہانی اور محیط سرخسی ہو، (۱۷) السراج الوہاج ص (۱۸) فتح القدیر ص ابن ہمام (۱۹) البحر الرائق ص (۲۰) الجامع الصغیر ص امام محمد، (۲۱) الجامع الوجیز ص للکردری م ۸۱۲ھ کی تصنیف ہے (۲۲) الیتیمۃ ص (۲۳) تاتارخانیہ ص عالم بن العلاء (۲۴) فتاویٰ سراجیہ ص الاوشی الفرغانی م ۵۶۹ھ میں لکھی گئی (۲۵) الاختیار فی شرح المختار ص (۲۶) کفایہ شرح ہدایہ ص جلال الدین الخوارزمی (۲۷) فتاویٰ برہانیہ ص (۲۸) الجوہرۃ النیرہ ص قدوری کی پہلی شرح ابوبکر الحدادی العبادی متوفی ۸۰۰ھ (۲۹) قنیۃ المنیۃ ص نجم الدین الزاہدی الفرغلی م ۶۵۸ھ (۳۰) محیط السرخسی ص (۳۱) النہر الفائق ص (۳۲) مبسوط ص امام سرخسی (۳۳) فتاویٰ الحجہ ص (۳۴) النہایۃ ص (۳۵) تحفہ ص (۳۶) الایضاح ص (۳۷) الحاوی ص (۳۸) الکافی ص (۳۹) خزانۃ الفقہ ص امام ابواللیث م ۳۸۳ھ (۴۰) الملتقط ص۱۱،

(۴۱) شرح المنیۃ للحلبی ص۱۱ (۴۲) الزاد ص۱۳ (۴۳) فتاویٰ غیاثیہ ص۱۱ (۴۴) شمنی ص۱۳ تقی الدین الشمنی م ۸۷۲ھ (۴۵) فتاویٰ شیخ الاسلام ص۱۵ المعروف بخواہر زادہ ص (۴۶) شرح المبسوط ص۱۲ (۴۷) غایۃ البیان ص (۴۸) منیۃ المصلی ص (۴۹) خزانۃ المفتیین امام حسین بن محمد السمعانی م ۷۴۰ھ کی تصنیف ہے (۵۰) عینی شرح کنز ص۲۲ (۵۱) المفید والمزید (۵۲) شرح منیہ ص۲۲ لابن امیر الحاج (۵۳) کنز الدقائق ص۲۲ (۵۴) خزانۃ الفتاویٰ ص۲۲ احمد بن محمد الحنفی صاحب مجمع الفتاویٰ (۵۵) الاسرار فی الاصول والفروع ص۲۵ ابوزید عبیداللہ بن عمر الدبوسی م ۴۳۰ھ (۵۶) شرح الزیادات ص۲۹ (۵۷) شرح النقایہ ص۳۵ شیخ ابوالمکارم (۵۸) الصغریٰ ص۳۵ (۵۹) شرح المجمع ص۳۶ لابن الملک (۶۰) تجنیس ص۳۶ صاحب ہدایہ (۶۱) نصاب ص۴۲ (۶۲) الکبریٰ ص۴۲ (۶۳) تنویر ص۴۲ شرح تلخیص جامع الصغیر (۶۴) غایۃ ص شرح ہدایہ (۶۵) فتاویٰ الغرائب ص (۶۶) محیط السرخسی ص (۶۷) فتاویٰ عتابیہ ص ابونصر عتابی م ۵۸۶ھ (۶۸) فتاویٰ قراخانی ناقلاً عن الواقعات الحسامیہ ص (۶۹) صیرفیہ ص دوسرا نام فتاویٰ آہو ہے، (۷۰) مختار الفتاویٰ ص لابی الفضل مجد الدین الموصلی م ۶۸۳ھ (۷۱) قدوری ص (۷۲) شرح منیہ ناقلاً عن الحاوی ص (۷۳) فتاویٰ التمرتاشی ص ابو محمد ظہیر الدین الحنفی م ۶۰۰ھ (۷۴) ینابیع ص [illegible] کی ینابیع الاحکام مراد ہے یا شرح القدوری (۷۵) شاہان شرح الہدایہ ص (۷۶) الفتاویٰ العتابیہ المعروف بجامع الفتاویٰ ص (۷۷) شرح مقدمۃ ابی اللیث متوفی ۳۸۳ھ (۷۸) مصفی ص (۷۹) وقایہ ص (۸۰) النقایہ ص (۸۱) تہذیب ص شیخ احمد القلانسی (۸۲) خانیہ ص (۸۳) جامع الجوامع ص (۸۴) جواہر الاخلاطی ص۹۱ (۸۵) الحصیر ص۹۳ (۸۶) البرجندی ص۱۰۲ (۸۷) غایۃ البیان ص شرح ہدایہ (۸۸) مختارات النوازل لصاحب الہدایہ (۸۹) برجندی ص (۹۰) اقرار العیون ص (۹۱) نفقات ص (۹۲) فتاویٰ الولوالجیۃ ص فتاویٰ کی کتاب ظہیر الدین ابوبکر الحنفی متوفی ۵۴۰ھ کی تصنیف ہے (۹۳) شرح نقایہ برجندی ص (۹۴) الغایۃ السروجی، ہدایہ کی شرح ابوالعباس احمد بن ابراہیم السروجی کی تصنیف ہے م ۷۱۰ھ (۹۵) المنتقی ص (۹۶) فتاویٰ الکبریٰ ص، حسام الدین عمر بن عبدالعزیز م ۵۳۶ھ (۹۷) فتاویٰ الصغریٰ ص حسام الدین عمر بن عبدالعزیز م ۵۳۶ھ (۹۸) الواقعات ص

(۹۹) المجتبیٰ (۱۰۰) التحریر شرح جامع الکبیر للحصیری جمال الدین محمود بن احمد البخاری المعروف بالحصیری م ۶۳۶ھ نے دو شرحیں لکھی ہیں، ایک مفصل ایک مختصر، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ حوالہ کس شرح کا ہے (۱۰۱) فتاویٰ امام کرخی م ۳۴۰ھ امام کرخی مشہور فقیہ ہیں (۱۰۲) البقالی (۱۰۳) شرح تلخیص جامع الکبیر (۱۰۴) ملخص المحیط (۱۰۵) الفصول العمادیہ، جمال الدین بن عماد الدین الحنفی (۱۰۶) الحاوی القدسی، قاضی جمال الدین احمد بن محمد المتوفی ۵۹۳ھ یا ۶۰۰ھ (۱۰۷) شرح کتاب الاستحسان، کتاب الاستحسان تمتی کی شرح شمس الائمہ حلوانی نے کی ہے یہ وہی شرح ہے، (۱۰۸) شرح الزیادات للعتابی، امام ابوالقاسم احمد بن محمد العتابی متوفی ۵۸۶ھ کی تصنیف ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر بے نظیر ہے (۱۰۹) کتاب رزین (۱۱۰) البحر الزاخر، سراج الوہاج جو مختصر القدوری کی شرح ہے، یہ کتاب اسی کا خلاصہ ہے، (۱۱۱) فصول الاستروشنی، امام مجد الدین ابوالفتح متوفی ۶۳۲ھ کی تالیف ہے (۱۱۲) فتاویٰ فضلی، ابو عمر عثمان الفضلی متوفی ۵۰۰ھ (۱۱۳) فوائد العلامہ شیخ الاسلام برہان الدین (۱۱۴) فوائد نظام الدین (۱۱۵) فتاویٰ نسفی، نسفی مشہور فقیہ ہیں (۱۱۶) فتاویٰ الخجندی، اپنے وقت کے تمام مشائخ کے فتاویٰ کو جمع کر دیا ہے (۱۱۷) فوائد بن سماعہ (۱۱۸) الواقعات الناطفیہ (۱۱۹) الاسعاف، برہان الدین ابراہیم بن ابی بکر الطرابلسی م ۸۴۳ھ نے اس میں اوقاف کے تمام مسائل اور جزئیات جمع کر دیئے ہیں (۱۲۰) فتاویٰ رشید الدین (۱۲۱) شرح ادب القاضی، غالباً صدر الشہید کی شرح مراد ہے (۱۲۲) فتاویٰ آہو جس کا دوسرا نام فتاویٰ ضمیریہ بھی ہے (۱۲۳) المستصفیٰ شرح النافع (۱۲۴) فتاویٰ ابی الفتح غالباً مجد الدین ابوالفتح م ۶۳۲ھ کے فتاوے مراد ہیں،

مآخذ کی یہ فہرست سرسری مطالعہ سے تیار کی گئی ہے، مزید تلاش و تفحص سے ممکن ہے کچھ اور نام بھی نکل آئیں، تاہم اس سے اتنا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ فتاویٰ کی تالیف میں کس قدر اہتمام تلاش و جستجو اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے،

عالمگیری کا سنہ تصنیف فتاویٰ عالمگیری کے سنہ تصنیف کی یقینی تعیین کرنا تو بہت مشکل ہے، لیکن ذیل کے بیانوں سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے، عالمگیر نامہ کا مصنف عالمگیر کی حکومت کے گیارہویں سال کے واقعات میں لکھتا ہے:

"چوں ہمگی ہمت والا نہمت شریعت پیرائے آں خدیو دین پرور حق پژوہ مصروف است باآنکہ

کافہ مسلمین در احکام دین متین ہمسائے کہ اکابر علماء و ائمہ مذہب شریف حنفی بیاں فتویٰ دادہ معمول بہا معمول علیہا دانستہ عمل نماید ...... معہذا مجموع آں را یک کتاب حاوی نیست ...... لاجرم بہ ضمیر مہر انوار در امور دین و دولت بفتوی الہام کارگذار است پرتو ایں عزیمت تافت کہ جمعے از علمائے پایۂ سریا علی کتب معتبرہ نسخ مبسوط آں فن را کہ در کتاب خانۂ خاصۂ شریفہ[1] بروزگاراں از اطراف و اکناف عالم فراہم آمدہ جلوہ گاہ انظار تتبع ساختہ از روی تحقیق و تدقیق وخوض و غور انیق بجمع تالیف آں مسائل پردازند و از مجموع آں نسخۂ جامعہ مرتب سازند تا ہمگناں را انکشاف مسئلۂ مفتی بہا در ہر باب بمراجعت آں کتاب بسہولت و آسانی دست دہد ...... چوں آں کتاب مستطاب صورت اتمام گیرد و پیرایۂ اختتام پزیرد جہانیاں را از سائر کتب فقہی مغنی خواہد بود"[2]

مرآۃ العالم میں ہے،

"چنانچہ قریب دو لکھ روپیہ صرف لوازم ایں کتاب مستطاب کہ زیادہ از یک لکھ بیت باشد شدہ، انشاء اللہ ہر گاہ آرائش تمام و پیرایہ اختتام یابد جہانیاں را از سائر کتب فقہی مغنی خواہد بود"[3]

ان بیانات سے اتنا معلوم ہوتا ہے، کہ ۱۰۸۰ھ میں جو عالمگیر کی حکومت کا گیارھواں سال ہے، اس سے کچھ پہلے فتاویٰ کا کام شروع ہو چکا تھا، مگر "چوں آں کتاب صورت اتمام گیرد و پیرایۂ اختتام پزیرد" سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی،

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر کا ذاتی کتب خانہ تھا جو بڑی کوشش سے جمع کیا گیا تھا جس میں فقہ کی تمام متداول کتابیں موجود تھیں [2] عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۶ [3] قلمی نسخہ دار المصنفین یہ کتاب بھی عالمگیر کی حکومت کے ابتدائی دس گیارہ سال کے واقعات پر مشتمل ہے،

اگر ۱۰۷۷ھ یا ۱۰۷۸ھ کو اس کی تالیف کا زمانہ قرار دیکر اسی کے ساتھ اس مشہور روایت کو بھی ملا لیا جائے کہ اسکی تالیف میں آٹھ برس کی مدت صرف ہوئی تو اس کی تکمیل کا زمانہ ۱۰۸۵ھ یا ۱۰۸۶ھ قرار پائیگا،

فتاویٰ کا فارسی ترجمہ، کتاب عربی میں لکھی گئی تھی، اس لئے عام لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے، انکی آسانی کے لئے اورنگ زیب نے چلپی عبداللہ اور ان کے چند شاگردوں کو اس کے فارسی ترجمہ کے لئے مامور کیا،

مراۃ العالم میں ہے،

"برائے سہولت ہمگنان ... چلپی عبداللہ ... با چند تلامذہ بترجم نوشتن این بفارسی مامور شد" (ص ۲۷۵ قلمی نسخہ)

تبصرۃ الناظرین میں ہے،

"چلپی عبداللہ بترجمہ آں (عالمگیری) مامور بود"[۱] (ص قلمی نسخہ)

مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ ترجمہ پورا بھی ہوا یا نہیں اور نہ اس کے وجود کا کوئی سراغ لگ سکا،

فتاویٰ کے مؤلفین کی صحیح تعداد کی تعیین مشکل ہے، تلاش و تفحص سے سولہ آدمیوں کے متعلق تذکروں میں یہ تصریح مل سکی[۲] ہے کہ وہ اسکی تالیف میں شریک تھے، جن کے حالات درج ذیل ہیں،

(۱) شیخ نظام برہان پوری، نظام نام، برہان پور (گجرات) وطن تھا، ابتدائی حالات اور خاندان کے متعلق تذکروں میں اور کوئی تصریح نہیں ہے،

قاضی نصیر الدین برہان پور کے مشہور متبحر اور متبع سنت عالم تھے، زیادہ تر انہی کی خدمت میں شیخ کی تعلیم و تربیت ہوئی اور استاذ کی توجہ اور نسبت سے خود بھی بڑے وسیع العلم متبحر عالم ہوئے[۳]،

عالمگیر کو شاہزادگی کے زمانہ میں جب دکن کا انتظام سپرد ہوا تو وہیں شیخ نظام سے ملاقات ہوئی اور ان کو اپنے دامن دولت سے وابستہ کر لیا، اور پھر آخر وقت تک جدا نہیں کیا، شیخ نے اپنی استعداد و قابلیت

[۱] معارف نمبر ۶ جلد ۷۹ مضمون "عالمگیر کا علمی ذوق" سید صباح الدین عبدالرحمٰن، [۲] اقتباس فرحۃ الناظرین [۳] تذکرہ علمائے ہند،

سے حکومت کے بڑے سے بڑے عہدے اور مرتبے حاصل کئے[۱]،

عالمگیر کی کوئی علمی و سیاسی مجلس مشکل سے شیخ نظام کی شرکت سے خالی ہوتی تھی، صاحب مآثر عالمگیری نے متعدد جگہ انکا تذکرہ کیا ہے[۲]، عالمگیر ان کا اتنا احترام کرتا تھا کہ دربار کے آداب و تسلیم کی پابندی سے مستثنیٰ تھے، محبوب الالباب میں ہے،

"از کورنش و تسلیم و دیگر تکالیف نوکری معاف بود" (ص ۵۱۲)

جب فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و تالیف کے لئے علماء کی جماعت منتخب ہوئی تو اس کی صدارت شیخ نظام کو تفویض ہوئی، عالمگیر نامہ کا مصنف "فتاویٰ عالمگیری" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے،

"و سرکردگی و اہتمام این مہم صعب انجام بفضیلت مآب شیخ نظام کہ جامع فضائل معقول و منقول است تفویض یافت" (ص ۱۰۸۶)

مراۃ العالم اور مآثر عالمگیری میں ہے،

"و سرکردگی این مہم اہم بقدوۃ انام شیخ نظام تفویض یافت" (ص ۲۷۴)

تذکرہ علمائے ہند میں ہے،

"در فتاویٰ عالمگیری سعی فراوان نمود"

شیخ عبدالرحمٰن بحراوی جن کی تصحیح کے بعد تیسری بار فتاویٰ عالمگیری ۱۳۱۰ھ میں مصر سے شائع ہوئی ہے، اپنے مختصر سے مقدمہ میں لکھتے ہیں،

"و جعل رئیسھم فی ذلک المولیٰ الھمام الشیخ النظام"

زمانۂ وفات کے متعلق کوئی تصریح تذکروں میں نہیں ملتی، اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اسی برس سے زیادہ کی عمر پائی، محبوب الالباب میں ہے،

[۱] اقتباس فرحۃ الناظرین، تذکرہ علمائے ہند، مآثر عالمگیری ص ۵۱۲ [۲] مآثر عالمگیری ص ۵۳۸، ۲۰۱، [۳] ص ۲۷۵ قلمی نسخہ دار المصنفین،

"ہنگام تحریر کتاب مرآۃ العالم عمر شریف شیخ مزبور از ثمانین متجاوز بودہ تاریخ وفات شیخ

دیدہ نہ شد" (ص۵۱۶)

محمد ساقی مستعد خاں نے ان کے پسماندگان میں چار لڑکوں ملک منور، شیخ لاڈ، شیخ عبداللہ اور شیخ ابو الخیر کا ذکر کیا ہے، ان میں تین یعنی ملک منور، شیخ لاڈ اور شیخ عبداللہ شاہی خطابات کے علاوہ منصب چار ہزاری سے بھی سرفراز تھے[۱]، اور شیخ ابو الخیر داروغہ جائے نماز تھے[۲]،

(۲) میر سید محمد قنوجی محمد نام، اور میر خطاب تھا، قنوج کے باشندے عہد عالمگیری کے مشہور اور وسیع العلم علماء میں تھے، ریاضی و ادب میں خاص دستگاہ رکھتے تھے شاہجہاں نے بڑی تعظیم و اکرام کیساتھ انھیں دربار میں بلایا اور اپنے مقربین خاص میں شامل کیا[۳]، شاہجہاں کے بعد جب عالمگیر تخت نشین ہوا تو اُس نے بھی ان کے ساتھ وہی برتاؤ قائم رکھا، اور جب اکبرآباد سے دلی آیا تو انھیں بھی اپنے پاس بلالیا[۴]،

عالمگیر کو امام غزالی کی تصنیفات، خصوصاً احیار العلوم سے بڑا شغف تھا، اُس نے امام کی اکثر کتابیں سید محمد قنوجی کی زیر نگرانی اور ان کی مدد سے مطالعہ کی تھیں، تذکرہ علمائے ہند میں ہے،

"مصنفات حجۃ الاسلام غزالی خصوص احیار العلوم پیش وے (سید محمد) دیدہ" (ص۲۱۵)

ہفتہ میں تین دن عالمگیر کی مخصوص علمی مجلس ہوتی تھی، جس میں لوگ میر صاحب سے استفادہ کرتے تھے، تذکرہ علمائے ہند میں ہے،

"در ہفتہ سہ روز بمذاکرۂ علوم در خدمت شاہی مجلس افادہ گرم داشتی" (ص۲۱۶)

ان کو دربار میں بھی کافی درخور حاصل تھا، عالمگیر کی ہر مجلس میں وہ شریک ہوتے تھے، شاہزادہ اعظم کا نکاح انہی کی وکالت میں ہوا تھا[۵]، ۱۰۹۱ھ میں عالمگیر اودے پور اور اجمیر کی مہم میں گیا، اور وہاں کے سیاسی حالات کی وجہ سے اسے کئی مہینہ رک جانا پڑا، اس لئے سید محمد قنوجی نے اجمیر جاکر

۱ مآثر ص۴۱۳ ۲ ایضاً ص۴۱۹ ۳ تذکرہ علمائے ہند ص۲۱۵ ۴ ایضاً ص۵ ۵ اردو ترجمہ مآثر عالمگیری ص۲۸۵ ۶ مآثر ص۱۹۵،

عالمگیر سے ملاقات کی، اس نے انکا بڑا اعزاز و اکرام کیا اور ایک ہزار نقد اور میووں کے دو خوان تحفہ میں پیش کئے[۱]،

جب فتاویٰ عالمگیری کی تالیف کے لئے علماء کا انتخاب ہوا تو قرعۂ انتخاب ان کے نام بھی پڑا، چنانچہ اس کی تکمیل میں ان کا بھی کافی حصہ تھا، تذکرہ علمائے ہند میں ہے،

"در تالیف فتاویٰ عالمگیری مساعی جمیل بکار بردہ" (ص۲۱۶)

وفات کے متعلق کوئی تصریح تذکروں میں نہیں ملتی صاحب مآثر عالمگیری ۱۰۹۱ھ کے واقعات کے ضمن میں لکھتا ہے،

"سید شریف پسر قدوۃ المشایخ میر سید محمد قنوجی استاذ اعلیٰ حضرت فردوس آشیانی (شاہجہاں) جو بفضل و کمال عقل و شعور مشہور و معروف تھے، کرورہ گنج کی خدمت میں مامور ہوئے" (ص۲۰۹)

اس بیان سے آشنایتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۰۹۱ھ سے پہلے وفات پاچکے تھے، مآثر عالمگیری نے ضمناً ان کے دو لڑکوں سید شریف و سید احمد کا ذکر کیا ہے، سید شریف کرورہ گنج کی خدمت پر مامور تھے[۲]، اور سید احمد قاضی محمد حسین کے انتقال کے بعد عہدۂ احتساب پر سرفراز ہوئے،

تلامذہ میں مولوی اصغر علی قنوجی بڑے صاحب علم اور صاحب تصنیف گذرے ہیں[۳]،

(۳) ملا محمد جمیل جون پور کے ایک علمی خانوادہ میں ۱۰۵۵ھ میں پیدا ہوئے، ان کے دادا ملا شمس نور اور والد ملا عبد الجلیل اور دو چچا ملا صادق اور ملا خلیل اپنے زمانہ کے ممتاز علماء میں تھے، اسی ماحول میں ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی اور اسی علم پرور فضا میں پروان چڑھے،

ابتدائی عربی و فارسی تعلیم کے بعد علامہ دیوان عبد الرشید (جو اپنے وقت کے مفتی عنایت احمد تھے)

۱ مآثر ص۱۲۱ ۲ ایضاً ص۲۰۶ ۳ تذکرہ علمائے ہند ص۴۲ ان کی چند تصنیفات یہ ہیں تصوف میں اللطائف العلیہ، تبصرۃ المدارج، تفسیر میں ثواقب التنزیل، اور اس کے علاوہ فصوص الحکم کی شرح اور کئی عربی قصیدے انکی یادگار ہیں،

سے مختصر المعانی اور شرح وقایہ وغیرہ پڑھی پھر مولانا نور الدین مداری کے درس میں شریک ہوئے، ان سے درسی کتابوں کے علاوہ اور علوم خاص طور سے پڑھنی شروع کی، ابھی کتاب ختم نہیں ہوئی تھی کہ استاذ نے دلی کا قصد کیا، شاگرد نے کتاب کے ختم نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کیا، استاذ نے فرمایا کہ اب تمھیں درس کی ضرورت نہیں ہے، مطالعہ کافی ہے[1]،

ملا جمیل طالب علمی کے زمانہ ہی سے ذہانت و طباعی میں ضرب المثل تھے، نہایت اخاذ طبیعت پائی تھی، ایک مرتبہ مطول[2] کی کسی دقیق عبارت کا مطالعہ کرکے اپنے استاذ مولانا نور الدین کی خدمت میں گئے اور اس عبارت کا مطلب وضاحت سے بیان کیا، استاذ نے فرمایا کہ اس عبارت کا مطلب آج میں نے تمھاری تشریح سے سمجھا[3]،

ملا جمیل کی فطانت اور ذہانت کی وجہ سے ان کے اساتذہ ان کو ملا جلال اور میر شریف کہا کرتے تھے، جس وقت وہ دہلی گئے تو سارے علما پر ان کی ہیبت طاری ہوگئی، مشاہیر جونپور میں ہے،

"آنچناں جودت ذہن بود کہ اگر یک بار متن کے کتاب بیند حاجت حاشیہ نماند، ہر مطالب دقیق کہ پیش آید فوراً بقوت ذہن حل گردد، بارہا استادش فرمودی کہ ملا جمیل را مماثل علامہ میر شریف و ملا جلال گفتن بیجا نیست، وقتیکہ ملا جمیل وارد دہلی شد، شہرۂ فضیلتش چناں شائع گردید و ہیبتش تاری (طاری) شد کہ ہر درسے کہ رسیدے درس موقوف گشتے، روزے در مدرسہ ملا لطف اللہ دہلوی رفت در یک سطر ہفت یا ہشت شبہات پیش نمود، ملا لطف اللہ از جوابش عاجز آمدند[4]"

ان کی زندگی کا عزیز ترین مشغلہ درس و تدریس تھا، چنانچہ تعلیم سے فراغت کے بعد ہی مسند درس پر بٹھا دئے گئے، اور تشنگان علم ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے لگے، مشاہیر جونپور میں ہے،

"عالم جملہ علوم گردید و درس گفتن آغاز کرد و چناں شد کہ بہ زمرۂ علمائے مشاہیر پیوست و علم یکتائی بافراخت بسیاری طلبہ از دستان فاتحہ فراغ خواندند" (ص ۸۱)

۱؎ مشاہیر جونپور ص ۸۰ ۲؎ معانی و بیان کی ایک کتاب ۳؎ مشاہیر جونپور ص ۸۱ ۴؎ ایضاً ص ۸۱.

جونپور کے محلہ مفتی میں ایک بہت وسیع اور پختہ خانقاہ اور ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا اور خود اس میں درس دینے اور اصلاح باطن کرتے تھے، سید نور الدین اس معہد علمی اور روحانی کی بربادی پر بڑی حسرت سے لکھتے ہیں،

"چون زمانہ دگرگوں شد اکنوں آثاری ہم باقی نماند جز اینکہ بر این سرزمین کہ پیش دروازہ شاہ طفیل حسین است کشتکاری می شود و چشم بصیرت مشاہدہ ہنجار دنیا می کند (ص ۸۹)"

ان کے تلامذہ کی تعداد بہت ہے لیکن ان میں مولوی نظام الدین اورنگ آبادی، مولوی نور الہدیٰ مجھوی اور ملا نور الدین جعفر غازی پوری زیادہ مشہور ہیں،

اصلاح باطن مشاہیر جونپور میں ہے،

"علاوہ فضائل صوری صاحب کمالات باطنی ہم بود و بیعت و ارادت از دیوان عبد الرشید داشت (رحمۃ اللہ)"

اٹھتر برس کی عمر پاکر ۷ رجب ۱۱۲۳ھ میں وفات پائی اور اپنے والد ملا عبد الجلیل کی قبر کے پہلو میں سپرد خاک کئے گئے، ذیل کی رباعی سے تاریخ وفات نکلتی ہے،

مرد ملا جمیل علمش مرد ۔۔۔ خانہ باقی نہ صاحب خانہ

بہر تاریخ فاضل نامی ۔۔۔ از فضیلت ربود افسانہ

پسماندگان میں تین صاحبزادوں کا ذکر صاحب مشاہیر جونپور نے کیا ہے، مولوی غلام معین الدین عرف شاہ امید علی، شاہ طفیل حسین و شاہ تمیم الحسن[1]،

ان کی اصل علمی یادگار تو تلامذہ کی وہ کثیر تعداد ہے جن کے ذریعہ ہزارہا تشنگان علم سیراب ہوئے ان کے علاوہ کچھ قلمی یادگاریں بھی ہیں، جن سے اہل علم آج بھی مستفیض ہو سکتے ہیں،

آپ نے مطول، شرح جامی کے ایک باب عطف اور بہت سی دوسری کتابوں پر حاشیے لکھے، اس کے علاوہ دو رسالے ایک فقہ اور ایک تصوف میں تنبیہات جمیلی تحریر کئے، لیکن سب سے بڑا زندہ جاوید کارنامہ فتاویٰ عالمگیری

۱؎ تیسرا نام صاف طور سے پڑھا نہیں گیا،

کی تصنیف میں شرکت ہے، مشاہیر جونپور میں ہے،

"وقتیکہ عالمگیر بادشاہ دہلی جہت نمود فتاویٰ منسوب باسم خود فضلائے ناموران دیار ہند

طلبید از جون پور ملا جمیل را برچیدہ ایشاں را بجہت خواستہ شریک مجمع اجتماع نمود (ص۵۸)

قاضی محمد حسین جونپوری جون پور کے باشندے اور اپنے وقت کے ممتاز علماء میں تھے، فرحۃ الناظرین میں ہے،

"از علم و فضل بہرہ وافر داشت (ص۸۲)"،

شاہجہاں کے عہد میں جون پور کے قاضی تھے، عالمگیر کے عہد میں الٰہ آباد کے قاضی مقرر ہوئے، جلوس عالمگیری کے ساتویں سال دربار شاہی میں حاضر ہوئے، عالمگیر نے انعام و اکرام کے علاوہ فوج کا عہدہ احتساب بھی ان کے سپرد کر دیا اور اس کے بعد سے برابر وہ اسی خدمت کو انجام دیتے رہے، محبوب الالباب میں ہے،

"وخدمت احتساب عسکر خلعت امتیاز پوشید و رفع مناہی و ترویج احکام رسالت پناہی و قمع

آلات ملاہی کوشش وارادہ بکار برد" (ص۵۱۶)

بختاور خاں پر جو عالمگیر کا بہت مقرب امیر تھا قاضی صاحب اور اُن کے علم و تقویٰ کا بڑا اثر تھا، چنانچہ عالمگیر سے بھی ان کے علم و فضل دیانت و تقویٰ کی تعریف کرتا تھا، ۱۰۷۹ھ میں عالمگیر نے ان کو عہدہ احتساب کے علاوہ اور بھی مناصب و مراتب عطا کئے، مآثر عالمگیری میں ہے،

"بادشاہ ہنر پرور نے ان کو ایک صدی منصب دار مقرر فرمایا، رفتہ رفتہ حسین علی خاں نے اعانت و امداد

اور اپنی سلیقہ شعاری سے مرتبہ امارت خانی پر سرفراز ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے،، (ص)

ان کے ان کمالات کی بنا پر انکو بھی فتاویٰ عالمگیری کی تالیف میں شریک کیا گیا، اور اس کی تکمیل میں ان کا بڑا حصہ ہے، تذکرۂ علمائے ہند میں ہے،

"در تالیف فتاویٰ عالمگیری بسے سعی نمودہ،، (ص)

محبوب الالباب میں ہے،

"یک ربع فتاویٰ عالمگیری تالیف نمودہ" (ص۳۳)

مآثر عالمگیری کے بیان سے سنہ وفات ماہ ذیقعدہ ۱۰۸۳ھ ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ اس سنہ کے واقعات کے ضمن میں لکھتا ہے،

"قاضی محمد حسین کے انتقال کی وجہ سے سید احمد پسر سید محمد قنوجی کو خدمت احتساب عنایت ہوئی،، (ص)

ارباب تذکرہ نے اولاد و پسماندگان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے اور نہ فتاویٰ کے علاوہ کسی دوسری علمی یادگار کا کوئی علم ہے۔

شیخ وجیہ الدین گوپاموی اودھ کا مشہور اور مردم خیز قصبہ گوپامؤ ان کا وطن تھا، نہایت ہی ذہین ذکی اور باطنی صفات تھے، علم و فن کے علاوہ تحریر و تقریر میں بھی ملکہ تھا، علم معانی و بیان میں بے نظیر تھے، فرحۃ الناظرین میں ہے،

"خصوصاً در علم معانی و بیان عدیم المثال عصر بود،، (ص۴۹)

شیخ جب دلی گئے تو پہلے پہل دارا شکوہ سے ان کا علمی تعلق رہا، دارا شکوہ کی وفات کے بعد عالمگیر کی حکومت کے نویں سال یعنی ۱۰۷۵ھ میں عالمگیر کے دربار میں حاضر ہوئے، اس نے حسب مرتبہ ان کی بڑی توقیر کی، اور منصب و مراتب سے بھی سرفراز کیا،

فتاویٰ عالمگیری کی تالیف میں عالمگیر نے ان کی خدمات بھی حاصل کیں، محمد اسلم کے بیان کے مطابق ایک چوتھائی کام ان کے سپرد کیا گیا،

"بہ ترتیب و تالیف ربعی از فتاویٰ عالمگیری مامور شد"[1]

فتاویٰ کی تالیف میں ان کے کام کی نوعیت و اہمیت کا اندازہ ذیل کی عبارت سے بھی ہوتا ہے،

زمخشری کی قسطاس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش خاں کی لائبریری میں ۱۱۰۰ھ کا لکھا ہوا موجود ہے، اس پر شیخ وجیہ الدین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی عبارت ہے، کاتب اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے،

"عبارت منقول از دستخط مولانا وجیہ الدین رئیس علمائے فتاویٰ عالمگیری"[2]

اس عبارت کے آخری ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ فتاویٰ کی تالیف میں ان کا کافی حصہ تھا، اور بعض اس میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل تھی،

(باقی)

---

[1] تبصرۃ الناظرین [2] فہرست مخطوطات فقہ پٹنہ خدا بخش خاں لائبریری،

دو کمیاب کتابیں

از جناب مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی

جنوری ۱۹۴۶ء کے معارف میں محترمی سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب نے حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی قدس سرہ العزیز کے حالات میں اُن کے ایک صحیح الارادت معتقد کا تذکرہ فرمایا تھا، جو زاد المسافرین اور نزہتہ الارواح وغیرہ کے مصنف تھے، ان کا متعارف نام تو امیر حسینی تھا، لیکن اصل اور پورا نام یا پورا لقب ہر تاریخ نویس اور تذکرہ نگار نے کم و بیش مختلف لکھا ہے، تفصیل صفحہ ۶۵ پر ملے گی، صاحب سیر العارفین نے امیر کی منجملہ متعدد تصانیف کے نظم میں زاد المسافرین اور نثر میں نزہتہ الارواح کا نام لیا ہے، سید مکرم نے نزہتہ الارواح کے ایک قلمی نسخہ کا موزۂ برطانیہ میں موجود ہونا ارقام فرمایا ہے،

صمدن (موطن سادات) میں ان میں سے بعض کتابوں کے موجود ہونے کا مجھے علم تھا، میری طلب خواہش پر برادر زادہ عزیز سید انیس احمد متعنا اللہ بطول حیاتہ ان کو لے کر میرے پاس آئے، میں نے ان کو دیکھا ان میں دونوں کتابیں موجود تھیں مگر متنوع اشغال سے ان کے متعلق کچھ لکھنے پر معذور رہا، ذیل کے سطور میں انہی کے متعلق کچھ تفصیل پیش کرنا ہے،

(۱) زاد المسافرین :- یہ مختصر سی مثنوی امیر کبیر سید حسینی ہروی کی قابل عزت تصنیف ہے جن کی نسبت استعارہ کی زبان فتویٰ دے چکی ہے،

چشم دولت زسوادِ قلمش گشتہ منیر   باغ دانش زسحابِ کرمش گشتہ نضیر

زاد المسافرین کمیاب کتابوں میں سے ہے، اپنے شدید مگر ناکام شوق مطالعۂ کتب قدیمہ اور محدود معلومات لیکن وسیع تلاش پر نگاہ ڈال کر مجھے بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ کتاب عزیز الوجود ہے، پیش نظر نسخہ انتخاب حدیقہ کے ہم جلد نور چشم سید انیس احمد کا حاصل کردہ و مملوکہ ہے، جن کو بیش قیمت قلمی کتابوں کے فراہم کرنے کا خاص سلیقہ اور ان پر طالبعلمانہ دست برد و تصرف میں ید طولیٰ حاصل ہے، آثار یہ کہتے ہیں کہ شروع ہی میں کسی شوقین و خوش فکر و خوش حال کی ملک میں رہا ہوگا، جلد برابری یا چمڑے کی زیبائی ارغوانی رنگ کی کاشانی مخمل نے پائی ہے، جس پر باہر کی جانب سفید جدول یا اکہری دھاری تھی، یا کوئی نازک سی باریک بیل رہی ہو، مگر اب مٹ چکی ہے، پھٹا کونے ہوئے کاغذ کی لبدی سے بنا تھا، کیڑوں کی ترک تاز سے مشبک اور خاک و خاکستر ہو رہا ہے، عمر رسیدہ ہو چکی پھول کی پنکھڑیوں کی طرح دفتین کے اجزا خود بخود بکھرتے چلے جاتے ہیں، کاغذ ولایتی، چکنا اور چمکدار، تقطیع اوسط کتابی، تعداد صفحات ۴۶ سطریں فی صفحہ ۱۸ خو صفحہ میں اور ۲۰-۲۰ مصرعے حاشیہ پر، جدول دہری خوش نما نظر فریب، الگ الگ نیلی اور سیاہ اور سنہری، مصنف اور کاتب کے نام سے پوری کتاب خالی ہے، حالانکہ کئی ورق اسی اہتمام و تکلف سے تیار کئے ہوئے آخر جلد میں سادہ لگا دیئے گئے ہیں، انتخاب حدیقہ اور اُس کے آخری صفحہ کی آخری سطر کے ساتھ ورق اُلٹ جاتا ہے، اور بلا کسی فصل و افتراق کے پہلی ہی سطر میں شنجرف سے زاد المسافرین لکھا ہوا جلوہ افروز ہوتا ہے، دوسری سطر خدائے رحمان و رحیم کے پاک نام اور اچھی شوخ سیاہی سے شروع ہوتی ہے، مثنوی کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے ؎

در ہفصد و بست و نہ ز ہجرت   گشت آخر ایں کتاب تمت

معارف نے "ایں کتاب ختمت" لکھا ہے، میرے نسخہ نویس نے تمت، اسی طرح پہلے مصرع کو معارف میں "ہفت صد و بست و نہ" چھاپا ہے، میرے نسخہ میں ہفصد و بست و نہ ہے، شاید شعر کا

وزن بھی ہفت کی ت گرا دینے کا متقاضی ہے، ممکن ہے کہ الفاظ کا یہ ردوبدل تذکرۂ دولت شاہ کے دخل در معقولات کرنے والے کاتب کے قلم کا ثمرہ ہو، جہاں سے مولانا نے اس کو نقل فرمایا ہے، ایسے اختلافات اور لفظی تغیرات معارف کے نقل کردہ چوبیس اشعار اور اس مکتوبہ میں جابجا نظر آتے ہیں، شعروں کا بے تکلفانہ تبادلہ اور کمی وبیشی بھی نمایاں ہے، مگر اس کا اثر نفس مضمون یا ادائے مدعا پر نہیں پڑتا،

شیخ صدر الدین (سید حسین) نے اس کتاب کو اپنے بزرگ مرشد شیخ بہاء الدین زکریا کے آستانۂ فیض گنجینہ بر ملتان میں بیٹھ کر لکھا تھا، اور حضرت نے اس کو بغور ملاحظہ فرمانے کے بعد اس ستودہ صفات ناظم کی تحسین و آفرین فرمائی تھی، مولانا صباح الملۃ والدین کے روبرو اصل کتاب نہ تھی تاہم موصوف نے اس کے متعلق علمی و عملی سرمایہ اور ظاہری و باطنی کمالات و کرامات سے مالامال ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، عجائب خانہ بریطانیہ اور کتب خانہ شاہانِ اودھ کی فہرستوں اور اولیا راشدا اور تلامیذ الرحمٰن کے تذکروں سے اقتباس و التقاط فرما کر بقدر ضرورت سب کچھ لکھ دیا ہے (معارف جنوری سنہ ۱۹۲۶ء صفحات ۴۶ لغایۃ ۵۱)

مجھے ان کے اعادہ و بازخوانی کی ضرورت نہیں ہیں صرف ان ہی چند باتوں کو حوالۂ قلم کرنا چاہتا ہوں، جو مولانا کے خامہ عنبر افشاں کے رشحات سے فیض یاب نہ ہو سکیں، اور اس کم سواد و بے استعداد کے لئے خود بخود چھوٹ گئی ہیں، مولانا کا یہ خیال بالکل صحیح ہے، کہ سید علیہ الرحمۃ کی اور تصانیف کی طرح زاد المسافرین کا موضوع سلوک و طریقت و معرفت ہے،

سب سے پہلے اپنی اس بے باکانہ جرأت اور گذارش کا عذر خواہ ہوں، کہ شیخ کے طرز بیان اور طرز ادا یا صوفیانہ تعلیمات کا اندازہ کرنے کے لئے جس حصہ مثنوی کا انتخاب دو ناقد باکمالوں یعنی دولت شاہ نے تذکرہ میں اور آذر نے آتش کدہ میں فرمایا ہے، وہ ایک حکایت ہے، بجائے خود وہ کیسی ہی دلچسپ و سبق آموز سہی تاہم اس ناقص الفہم تبصرہ نگار کے نزدیک اس کے اشعار میر کے

بہترین کلام یا زاد المسافرین کے زیادہ بلند و برتر یا شیرین ترین ابیات میں شمار نہیں ہو سکتے،

مثنوی کا آغاز حمد باری تعالیٰ شانہ سے کیا جاتا ہے، پروردگار عالم و عالمیاں کے حضور میں اسکی نعمتوں اور رحمتوں کا اقرار و اعتراف کرتے ہوئے انبیاء و رسل علیہم السلام کی حیرانی و سرگردانی کا ذکر فرماتے ہیں اور بلاشبہہ بڑی قابلیت اور عالمانہ فضل و کمال کے ساتھ اس صحیفۂ رشد و ہدایت اور وحدت پرستی کی تعلیم کا آغاز فرماتے ہیں، حتیٰ کہ نعت شریف و مناقب ابرار و اطہار کی منزلیں طے کرنے کے بغیر ہم ایسے نااہل دنیا داروں سے خطاب ہوتا ہے،

بشنو پسرا بیان حالت — علم و جدلست قیل و قالت
علمے کہ خدائے داں شوی تو — انیست کجا ہمی دوی تو
آں علم طلب کہ با تو ماند — داں دم کہ ترا ز تو رہاند
آں علم فریضہ تا نہ خوانی — تحقیقِ صفاتِ حق نہ دانی
اے طبع و ہوا معلّم تو — تا کی لم و لا نسلّم تو
خود را بگذاف کردہ گرم — آخر ز خدا نبایدت شرم
از خود بخدا مرد بتاویل — تشبیہ مکن بوجہ تسیل،
زنہار بحجتِ قیاسی — ہرگز نشوی بحق شناسی

اس کے بعد مقالات شروع ہو جاتے ہیں اور ان مقالات کے دوران یا ذیل میں متعدد حکایات قصیر و طویل بھی آتی جاتی رہتی ہیں،

پہلا مقالہ جس کو خوشنویس نے "مقالات اول" لکھ دیا ہے، حق سبحانہ تعالیٰ کی تنزیہ و تقدیس اور سالک کو ریاضت و مجاہدہ کی تلقین و تشویق میں ہے، اس میں بھی وہی خطیبانہ رنگ اور واعظانہ انداز بیان قائم رکھا ہے، فرماتے ہیں:-

ہندو کہ ہمیشہ بت پرستد   ہر صبح دعات می فرستد

جز ذکر تو نیست در زبانش   زنار و فاست در میانش

ایں جملہ ز دین و ملت خویش   جز تیر غمت ندیدہ در کیش

اس کے آگے وہ شعر آجاتا ہے جو مشہور عام اور مقبول خاص ہو چکا ہے اور جس کی نسبت مجھے شبہہ ہے کہ کسی اور باکمال ہنرمند کا ہے، یعنی

مرغانِ چمن بہر صباحے   خوانند ترا با صطلاحے

مرغانِ چمن کی کچھ تفصیل بھی موجود ہے،

چوں فاختہ ہر کہ در جہان است   کوکو زنِ کوے قستِ یوسعت

دوسرا مقالہ فضیلت و شرف انسانی کی بحث میں ہے، غفلت و نادانی پر سرزنش،

اس میں فارسی زبان کی سلاست و لطافت کے ساتھ ساتھ بعض غیر معمولی عربی الفاظ یا نامانوس کلمے بھی کہیں کہیں آگئے ہیں، اس کی پہلی حکایت ملاحظہ ہو،

موسیٰ ز ئی فراق محمود   مستانہ دوید بر سر طور

گفت اے ز تو بود ہر چہ بودہ   مارا بتو ہم تو رہ نمودہ،

گر نز دمنی بکجات جویم   تا با تو حدیثِ خویش گویم

ور دور تری برآرم آواز   باشد کہ بخود درم کنی باز

بشنو تو ز ہاتفے جوابے   کے از تو بہ پیش تو نقابے

ایں جائے حوالہ نیست بگذار   من با توام از خودم طلب دار

رفتادنِ مہرہ ہا بشش در   اینجا بود اے حریف بنگر

شاہانِ جہاں دریں خیالات   بر نطع غمند جملگے مات

از غایتِ قرب دور دور است   ہر مرغ چو دانہ جبو راست

ایں آتشِ ما بگو نہ میرد   کیں درد دوا نمی پذیرد،

یادآر ز خود کہ نیست یادت   بے شرم کسے کہ شرم بادت

تیسرا مقالہ طریقت اور سلوک کی کیفیت میں ہے،

چوتھا ارشاد و معاملت میں، اس میں سالک طریقت کی توصیف میں ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے، حکایتیں کئی ہیں "رسیدن سالک بہ نفس دل" پہلی ہے،

ایک حکایت وہ بھی ہے جس کو دولت شاہ اور آذر نے نقل کیا ہے، یعنی

ایں طرفہ حکایت ست بنگر

پانچویں مقالہ میں عشق اور اُس کے مرتبہ کا بیان ہے، اپنے مخصوص رنگ میں پورے زور کیساتھ لکھا ہے،

چھٹا مقالہ معرفت نفس انسانی اور اُس کی صفت میں ہے،

ساتویں میں معرفت کا بیان اور اسکی تحقیق ہے اور خوب ہے،

آٹھویں مقالہ کا عنوان ہے "دربیانِ حال شرف باد شرف می رسد" یہ مقالہ اپنے ماسبق مقالوں سے کسی قدر درازتر اور تمثیلات سے معمور ہے، اور اسی پر چند در چند مواعظ و نصائح و مخاطبات کے ساتھ مثنوی ختم ہو جاتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:-

دُریست گراں بہا کہ سفتم   دریاب کہ گفتنی بگفتم

ہمدستۂ گلبنِ یقین است   ہم توشۂ رہروانِ دین است

از بس کہ فشاند بحر من دُر   شد دامنِ آخر الزماں پر

ایں گلشکرے کہ من سرشتم   در ہشت مقالتش بنشتم

شمع است کہ از دلم برافروخت   ہفتاد و ہزار پردہ راسوخت

یک نکتۂ او کہ جاں کند شاد / بر دل در بہشت باغ بکشاد
آنکس کہ بیافت اندکے بوے / دانست کہ چوں شگافتم موے
تاجست سراں نا مور را / نہ پارہ دست کون خر را
چوں اہل خرد بیر دیارے / زیں تحفہ برند یادگارے
ایں نور بہر طرف کہ تابد / یعنی کہ قبول ہر کہ یابد
زیں گنج کہ رایگاں کشادم / دارد بدعاے خیر یادم
در ہفصد و بیست و نہ ز ہجرت / گشت آخر ایں کتاب تمت

یہی آخر اس چودہ سو چھپن (۱۴۵۶) بیتوں کی مثنوی اور میرے ناچیز تبصرہ کا ہے،

۲- نزہۃ الارواح :- یہ کتاب بھی امیر حسینی کی تصنیف ہے، اکتوبر ۴۶ء کے معارف میں مولوی پروفیسر عبد الحمید خاں صاحب نے سلطان جہاں منزل کے کتبخانہ عالی کے نزہۃ کے ایک قلمی نسخہ کا حوالہ دیا ہے، اور نمبر ۴۳ پر کسی قدر زیادہ شرح و بسط سے بیان فرمایا ہے، اپنی کتاب کے مطالعہ کے بعد میں بھی موصوف کی تحریر اور راے زریں کی تائید کرتا ہوں، اس کی اٹھائیس فصلیں ہونا مسلم، اور ان کی تفصیلات و مباحث بھی صحیح ہیں، زبان البتہ بعض جگہ توجہ طلب اور قدرے مشکل ہی طرز ادا مغلق اور پیچیدہ، ایک تو تصوف و طریقت خود ہی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اس پر مستزاد یہ کہ فاضل مصنف نے اپنی مشکل پسندی اور دقت نظر سے مجھ ایسے عامی پڑھنے والے کے لئے کہیں کہیں اور بھی دشوار فہم و لغت آموز بنا دیا ہے، نزہت میں جو عربی ابیات و اشعار داخل ہیں وہ بھی دشواری و اشکال سے خالی نہیں، جو زریں قبائیں دوسروں سے مستعار لی ہیں ان میں بھی یہ خشن اور کرباسی پیوند نمایاں ہیں، اللھم اغفرلہ،

انیس مد عمرہ کا نسخہ جیبی تقطیع کا قیمتی ولایتی کاغذ پر ہے، مطلا و مذہب، جداول نہایت خوشرنگ،

نگہ فریب، سرورق سنہرا نازک، باریک قلم کا خط نہایت پاکیزہ نستعلیق شاندار، اوراق موجودہ کا شمار ۱۵۸، حاشیوں پر جو عبارتیں اور اشعار بعد کتابت اضافہ کردئے گئے ہیں ان میں سے بعض میں حضرت مصنف نے خود کو حسینی، کہہ کر یاد فرمایا ہے، ع "اے حسینی چو اوست فاش و نہاں ... ..."

یہ سب اضافے پختہ اور صاف خط میں مگر دوسرے قلم اور دوسری سیاہی سے ہیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ اضافے حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے ہیں یا کسی غیر کے،

تصوف کی کسی کتاب کی نسبت یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ اس کا مصنف جماعت اہل سنت سے ہے تاہم قاریان فخام کے لئے اس قدر اطلاع مناسب سمجھتا ہوں کہ اس میں نعت پاک کے بعد امیر المومنین ابو بکر صدیق اور فاروق اعظم اور عثمان ذی النورین کے مناقب ہیں، رضی اللہ عنہم،

امیر المومنین علی مرتضی کرم اللہ وجہہ کے بارہ میں اُن کے دونوں بابرکت پیش روؤں کے مقابلہ میں کسی قدر زیادہ سطریں پائی جاتی ہیں اور زوردار، لیکن حاشا کہ ان میں تفضیل یا میل الی التشیع کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا، اس کے بعد فصول اور مبادی و معارف و مقالات سلوک شروع ہو جاتے ہیں،

میرے لئے سب سے زیادہ رنج وہ یہ بات ہے کہ اس کے اوراق آخریں غائب ہیں، حتی کہ مصنف علیہ الرحمۃ والغفران کا لکھا ہوا خاتمہ جو خان غلام نے نقل فرمایا ہے وہ بھی اس نسخہ میں باقی نہیں، اس نسخہ میں فصل بست و ہشتم کے دو صفحے پورے کرکے لکھا ہے،

"یعنی چوں بمقصد رسید مقصود آں نامراد، بخاطرش بگذشت دست بہ عابر تا دستبردی
نماید گفت اے کرمت بای ماند گا نرا ...... (باقی مفقود)

معارف کے قاریان معظم میں سے کسی خوش نصیب کے یہاں نزہۃ کے یہ آخری اوراق محفوظ ہوں تو براہ کرم (مقبول صمدنی، یحییٰ پور، الہ آباد کے پتہ سے) مجھے آگاہ فرما دیں تاکہ ان اوراق کی نقل حاصل کرنے کا انتظام کروں، اور یہ قدیم نسخہ مکمل ہو جائے، واللہ لا یضیع اجر المحسنین،

استدراک، تبصرۂ بالا کی رسید ادارہ عالیہ معارف سے آچکی تھی کہ ایک اضافہ طلب بات میرے علم میں آئی، تحقیق ضروری کے بعد مزید تفصیل گذارش کیجائے گی، انشاء اللہ المستعان،

مطبوعات کی فہرستوں کی ورق گردانی سے جو انتخاب حدیقہ کے لئے کی گئی یہ واضح ہوا کہ (۱) مثنوی زاد المسافرین منشی نول کشور کے مطبع میں چھپ گئی ہے، ڈیڑھ آنہ قیمت ہے، البتہ ۱۹۲۴ء کی فہرست کتب (ص ۹۳) میں معمولی بے احتیاطی یا ناواقفیت سے یہ لکھا گیا تھا کہ "ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے، تصوف کے رموز خوب بیان کئے ہیں،" ۱۹۳۴ء (ص ۱۲۵) میں اصلاح ہو گئی، سید حسینی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف قرار پائی ہے۔ ۱۹۳۶ء کی فہرست میں بھی یہی انتساب قائم رہا،

(۲) اسی نام زاد المسافرین کی ایک کتاب حکیم ناصر خسرو کی تصنیف ہے، برلین (جرمنی) کی شرکت کاویانی نے جو قدیم وجدید فارسی کی قابل قدر مفید کتابوں کی طباعت واشاعت کے لئے مشہور ہے، اسکو چھاپا ہے، اور اس کو حکمت وفلسفۂ اسلامی پر بہترین تصنیف، معرکۃ الآرا کتاب، اور عرصہ سے نایاب بتایا ہے، ناشران کی جانب سے یہ بھی اعلان ہے کہ اس کی چھپائی میں اہتمام خاص کیا گیا ہے، حجم چھ سو صفحات سے زاید، قیمت آٹھ روپیہ،

القضاء فی الاسلام

اس میں طریقۂ شہادت، اور انفصال مقدمات کے متعلق قرآن حدیث اور فقہ کی کتابوں سے اخذ کرکے اسلامی اصول اور قوانین کی تشریح کی گئی ہے، اور قانون پیشہ حضرات کے لئے اس کا مطالعہ بیحد مفید ہے،

ضخامت:- ۹۲ صفحے، قیمت ۱۰/

"منیجر"

سندھی رسم الخط کی تاریخ

سندھ کے ایک سابق گورنر کے قلم سے

مترجمہ جناب نیاز احمد صاحب صدیقی ایم اے لکچرار شبلی کالج اعظم گڈھ

"آپ کا بھیجا ہوا نوٹ پڑھا، ماشاء اللہ آپ کے نئے گورنر صاحب علمی بھی ہیں، شاید سندھ سے مسلمانوں کی محبت بھی تحفہ میں ساتھ لائے ہوں، گو انگریزوں کو مقامی حالات کے مطابق چلنے میں کچھ دیر نہیں لگتی، سندھی رسم الخط کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، یہ صحیح معلوم ہوتا ہے، ۳۰۳ھ میں مقدسی عرب سیاح یہاں آیا ہے، اور اس نے لکھا ہے کہ یہاں کی زبان سندھی ہے، اور فارسی عربی بھی سمجھی جاتی ہے، یہ صوبہ مدت تک ایرانیوں کے ماتحت رہا ہے، اور اثرات یہاں پہلے سے تھے، عربوں کے داخلہ کے بعد عربی الفاظ کی آمیزش ہوئی، چنانچہ آپ کو تعجب ہوگا کہ سندھی میں پیاز کو بصل اور پہاڑ کو جبل کہتے ہیں، جو خالص عربی لفظ ہیں، پانچویں صدی ہجری کے شروع میں یہاں ابوریحان بیرونی آیا اور کئی سال مقیم رہا ہے، اس نے اپنی کتاب الہند میں جو ہندی الفاظ لکھے ہیں محققین کا بیان ہے کہ وہ سندھی تلفظ میں ہیں، البتہ علمی و مذہبی مسائل میں انکی اصطلاحیں سنسکرت ہیں،

جن مسلمانوں کی زبان عربی یا فارسی تھی وہ عربی رسم خط رکھتے تھے، فارسی نستعلیق خط نویں صدی ہجری کی پیداوار ہے، وہ اگر سندھی میں بھی کچھ لکھتے تھے تو عربی ہی خط میں لکھتے تھے، نستعلیق فارسی رسم الخط صرف مغل دربار اور دفتروں میں رائج تھا، ورنہ بنگال میں بنگالی اور دکن میں دکھنی اور گجرات میں گجراتی جو مسلمان لکھتے تھے وہ عربی ہی خط میں لکھتے تھے، چنانچہ چند سال ہوئے کہ کلکتہ ایجوکیشنل کانفرنس

میں ایک بہت موٹی بنگالی زبان کی کتاب پیش کی گئی تھی جسکو میں نے دیکھا تھا وہ عربی رسم الخط میں تھی، سلطان قطب شاہ وغیرہ کے دیوان دکنی میں اسی خط میں ہیں اور گجراتی کتابیں بھی اس خط میں میں نے دیکھی ہیں،

یہی حال سندھی کا بھی تھا، گو دربار کی زبان فارسی تھی، مگر خط عربی آمیز تھا، اور انگریزوں کے داخلہ کے وقت یہی صورت تھی، لیکن ہندو جن کا تعلق شاہی درباروں سے نہ تھا اپنے بنج کے اغراض سے ہندی رسم الخط رکھتے تھے، جب انگریزوں نے فارسی کو بیدخل کیا تو ہندوستان میں اردو کو دفتری زبان قرار دے کر اردو ہندی رسم الخط کو قبول کیا، اسی طرح سندھ میں عربی اور ہندی دونوں رسم الخط مسلمان اور ہندوؤں میں مروج پذیر تھے، اب جیسا کہ صاحب مضمون نے بیان کیا ہے کہ دو برطانی افسروں میں سے ایک نے عربی رسم الخط کو اور دوسرے نے ہندی رسم الخط کو پیش کیا، لیکن بخت و اتفاق سے یا سندھ میں مسلمانوں کی کثرت آبادی کے سبب سے عربی رسم الخط کی تجویز کامیاب ہوئی اور انگریزوں کے ڈر سے یہ بات ہوئی کہ ہندوؤں نے بھی اس رسم الخط کو مجبوراً مان لیا، لیکن سندھی ہندوؤں میں اب تک اسکے خلاف تحریک اٹھتی رہتی ہے، جیسے پنجاب میں سکھوں نے گو فارسی رسم الخط قبول کر لیا ہے مگر گورمکھی کے لئے اب بھی وہ کوشاں ہیں۔ "م"

(۱) عام طور سے لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ سندھی حروف تہجی اور اس کی تحریری زبان کے لئے سندھ اپنے برطانوی حکاموں کا مرہون منت ہے، جب سر چارلس نپیر نے سندھ فتح کیا، اس وقت گو ملک کی خود اپنی ایک مستقل زبان موجود تھی، لیکن اس کے ایسے حروف تہجی نہ تھے جو عام طور سے رائج ہوں، عام تحریری کاروبار ہندو منشی کرتے تھے، جس میں وہ فارسی رسم الخط میں مخلوط فارسی و سندھی زبان لکھتے تھے کتاب "ابوالحسن سندھی" جس کو برطانوی فتح کے وقت طالب علموں میں پڑھاتے تھے، درحقیقت بامحاورہ سندھی کو عربی حروف تہجی میں لکھنے کی ایک کوشش تھی، اور واتھن کی "گرامر آف سندھی" کا بھی یہی مقصد تھا، یہ کتاب سنہ ۱۸۶۲ء میں عربی رسم الخط میں ان پولیٹکل افسروں کے لئے لکھی گئی تھی جو امرائے سندھ کے درباروں سے وابستہ تھے ہندو تاجروں نے بھی اپنے حساب و کتاب کیلئے ایک قسم کا دیوناگری رسم الخط قبول کر لیا تھا،

(۲) فتح سندھ کے آٹھ سال بعد جب سر بارٹل فریر نے صوبہ کا نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیا اس وقت صرف دو ایسے برطانوی افسر تھے جو سندھی بول سکتے تھے، لیکن ان کے کلرکوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو سندھی لکھ سکتا ہو، اس لئے سول حکام کو عام بول چال کی زبان کا امتحان پاس کرنے کے احکام صادر کئے گئے، لیکن سندھی زبان کو سرکاری مراسلات میں استعمال کرنے کے لئے اس کے حروف تہجی کا متعین کرنا ضروری تھا، اس بارہ میں صرف دو افسروں کو جو سندھی زبان جانتے تھے، رائے دینے کا حق تھا، ایک کیپٹن رچرڈ، دوسرے کیپٹن اسٹیک، لیکن بدقسمتی سے اس بارہ میں ان دونوں کے خیالات ایک دوسرے کی ضد تھے، رچرڈ عربی حروف تہجی کی حمایت میں تھا، اور اسٹیک ہندی رسم الخط کے حق میں، جو پہلے سے سندھ کے تاجروں میں رائج تھا، اس زمانہ میں بھی فریر اس مسئلہ کے نسلی و قومی پہلو کی وجہ سے تذبذب میں پڑ گیا، اس کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ ہندو عربی رسم الخط سیکھنے کے لئے آمادہ نہ ہوں گے، اور مسلمان ہندی رسم الخط کے استعمال سے انکار کریں گے، لیکن سنہ ۱۸۵۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز نے عربی حروف تہجی کے حق میں فیصلہ کر دیا، اس وقت سر فریر نے، مسٹر ایلس کو جو اس وقت حیدرآباد کے کلکٹر تھے، ایک قسم کے حروف تہجی کے اجرا کا کام سپرد کیا، موجودہ سندھی حروف تہجی اسی کا نتیجہ ہیں، لیکن سندھی میں ۵۲ حروف تہجی ہیں اور اس کے مقابلہ میں عربی میں کل ۲۹ ہیں، اس لئے اصل سندھی کے لہجوں اور اس کی صوتی خصوصیات کو قائم رکھنے کے لئے اس کمی کو نقطوں کے ذریعہ پورا کیا گیا،

۳- اس نئے رسم الخط نے بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کی اور اس کی وجہ سے سندھی صوبہ کی سرکاری زبان بن گئی، اور سرکاری دفاتر سے فارسی خارج ہو گئی، اس رسم الخط کے اجرا کے بعد اگر یہ نامناسب کوشش نہ کی گئی ہوتی کہ ہندوؤں کے استعمال کے لئے ہندی حروف تہجی بنائے جائیں تو اس رسم الخط کی فضیلت مسلم ہو جاتی، اس نئی اور غلط تحریک کے بانی ایک دکنی برہمن مسٹر نارائن جگناتھ وادیا تھے، جن کو حکومت بمبئی نے سندھ کا ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر مقرر کیا تھا،

(۴) یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہئے کہ سنہ ۱۸۶۲ء تک پھر اس کے بعد سنہ ۱۸۶۶ء سے سنہ ۱۸۸۶ء تک سندھ میں کوئی مستقل ایجوکیشنل انسپکٹر مقرر نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اس عہدہ کے فرائض بھی یورپین افسروں کے سپرد کردیئے جاتے تھے، جو دوسری ذمہ داریوں اور کاموں کی مشغولیت کی وجہ سے تعلیمی پالیسی سے پوری دلچسپی نہ لے سکتے تھے، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مٹا دیا جو سندھ میں ۷۵ سال تک ہندؤں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھاکر دیہاتی ہندو حروف تہجی کے بارہ میں پورے زور وشور کے ساتھ تجربات کرتے رہے، اور انھوں نے انکو حروف علت کی مزید علامات کی مدد سے ترقی دے کر معیاری بنادیا، اس کے بعد سنہ ۱۸۶۸ء میں ان نئے حروف کو اسکولوں میں رائج کرنے کے لئے حکومت بمبئی کو آمادہ کیا گیا، اور اسکے لئے اور بہت سی مراعات اور سہولتیں حاصل کی گئیں، اس کی تعلیم کے لئے خاص اسکول کھولے گئے، جو اساتذہ ٹریننگ حاصل کر رہے تھے انھیں مجبور کیا گیا کہ وہ اسے خود سیکھیں اور موجودہ عربی سندھی مدرسوں میں طلبہ کو سکھائیں، اسی کے ساتھ کل مدرسوں کو میونسپل رقبہ میں یکجا کرنے کا کام بھی جاری رہا، اور اس کے باوجود کہ اسکولوں کے اخراجات مشترکہ مالگذاری اور سیس سے چلتے تھے اس کوشش سے دس سال میں یعنی سنہ ۱۸۶۰ء سے سنہ ۱۸۷۰ء تک جبکہ زیر تعلیم مسلمان لڑکوں کی تعداد کل دوگنی ہوگئی تھی ہندو لڑکوں کی پانچ گنی ہوگئی،

(۵) لیکن مسٹر ہنٹہ کی پرجوش حمایت اور سیس کی امدادی رقم کے باوجود ہندی سندھی حروف تہجی کو مقبول بنانے کی مہم ناکام ثابت ہوئی، اور سندھ کے اسسٹنٹ کلکٹر مسٹر دیارام گدومل کو جو خود سندھی کے عالم تھے اس رسم الخط کی منسوخی کی سفارش کرنا پڑی، انھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ تجارتی جماعتیں بھی اس نئے حروف تہجی سے بے تعلقی کا اظہار کرتی ہیں، اور بنیوں کے بچے اس کو صرف اس لئے سیکھتے ہیں کہ اسکول چھوڑنے کے ساتھ ہی اس کو بھلادیں، اور اپنے پرانے شارٹ ہینڈ والے خط کو اختیار کرلیں، اس وقت اور جیسا کہ اب بھی ہے، ہندو دوکاندار اپنے حساب وکتاب کے لئے کچھ خفیہ علامات رکھتے تھے، جس کو وہی سمجھ سکتے تھے، اور وہی اس کی تشریح کر سکتے تھے، ان کو کسی ایسے طرز تحریر سے کوئی دلچسپی نہ تھی جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہو، مسٹر گدومل کے ان خیالات کی تائید مسٹر گائیز کمشنر نے بھی کی اور سرکاری سرپرستی ختم ہونے

کے بعد یہ رسم الخط آپ اپنی موت مرگیا،

(۶) لیکن اس نامبارک تجربہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ بایک میں مسلمانوں میں ناراضی پیدا ہوگئی، انھوں نے دیکھا کہ فرقہ دارانہ پروپگنڈے کو تعلیمی جوش وخروش کا جامہ پہنا کر کس طرح بیرونی حکومت کو گمراہ کیا جاسکتا ہے،

اب اس قسم کی کوشش کہ عربی سندھی رسم الخط کے بجائے کوئی ہندی رسم الخط رائج کیا جائے، محض بے نتیجہ اور ناکامی کے مرادف ہے، لیکن اب بھی سندھ میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو مسلم کلچر کی فضیلت کو لعنت تصور کرتے ہیں اور اپنی مایوس امیدوں کو تقویت دینا چاہتے ہیں، تقریبًا دس سال ہوئے مروجہ رسم الخط پر یہ نیا حملہ کیا گیا کہ اس میں کم سے کم نو زائد حروف ہیں جن کو خارج کر دینا چاہئے اور یہ کہ ابتدائی خالص سندھی ایسے الفاظ کی آمیزش سے جن کی بنیاد عربی اور فارسی پر ہے، مسخ ہوگئی ہے، اس لئے ان مصلحین کے لئے جن کی یہ خواہش ہے کہ سندھی کو پھر اس کی ابتدائی خوبصورت شکل میں لے آیا جائے مناسب ہے کہ عربی وفارسی مادوں کے تمام الفاظ کو جن سے سندھی زبان مالامال تھی نکال دیں، اور ان کے صرفی قواعد اور جملوں کے آخری کلمہ میں بھی تبدیلی کیجائے جو اس قابل نفرت بنیاد کی یادگار ہیں، اور زائد حروف کو بالکل نکال دیا جائے،

(۷) چونکہ آج بھی ایسے فرقہ پرست خواب دیکھنے والے موجود ہیں، اس لئے ان موانع کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوا جو اس خواب کی تعبیر میں حائل ہیں، اب ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس نئی خوبصورت زبان سے واقف اور اس کے لئے آمادہ ہو کہ اپنی تمام کوششیں اس زبان کو سکھانے میں صرف کردیگا،

تاریخ فقہ اسلامی

مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہاء پر مکمل اور ایسا تبصرہ ہے، جس سے جدید فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہے، حجم ۴۸۰ صفحے، قیمت ہے،

"منیجر"

خاتمۂ مسئلہ سود و قمار وغیرہ

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی

میں متلصص (یعنی مسلمان جاسوس جو بطور جاسوسی دار الحرب میں جائے) اس کے "جواز عقد ربا" کا قائل ہوں حالانکہ اہل حرب اس سے بالفعل برسر جنگ نہیں ہوتے، مگر چونکہ ان سے نہ حکومت اسلام کا معاہدہ ہے، نہ جاسوس نے معاہدۂ امن کیا ہے اسلئے اس کے حق میں اہل حرب کے نفوس و اموال دونوں غیر معصوم اور مباح ہیں، اور اس کے لئے اہل حرب کے وہ اموال بھی حلال ہیں جو عقد ربا سے حاصل کرے"۔ (معارف جولائی ۱۹۴۶ء ص ۲۱)

ہمارے واجب الاحترام بزرگ مولانا ظفر احمد صاحب کا جب یہی فتویٰ ہے تو اب ان سے خاکسار کا اختلاف ہی کیا رہ گیا، مسلمانانِ ہند نے موجودہ غیر اسلامی حکومت سے اگر معاہدہ بھی کیا ہے، تو ظاہر ہے کہ اسی بات کا معاہدہ کیا ہے کہ جو قانون قیام امن و امان کے لئے وہ نافذ کرے گی اس کی پابندی کریں گے، اور جو قانون اس حکومت نے نافذ کیا ہے، اس میں چوری ڈاکہ فریب وغیرہ کے ذریعہ سے ملک کے کسی باشندے کے مال کے لینے کو جیسے ناجائز ٹھہرایا گیا ہے، اسی طرح ربوا اور اسی قسم کے بعض دوسرے عقود جو اسلامی نقطۂ نظر سے عقود فاسدہ ہیں، ان کے ذریعہ سے لین دین کو نہ صرف جائز ہی قرار دیا گیا ہے، بلکہ ان فاسد ذرائع سے لوگوں کے جو مطالبات ایک دوسرے پر عائد ہوتے ہیں، ان کی باضابطہ ادائگی کی وہ ذمہ دار ہے، اس کے حکام ان کی ڈگریاں دیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ حکومت قائمہ کے اس قانون کے بعد کسی حیثیت سے بھی یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ مسلمانانِ ہند نے قانون کے ان جائز ذرائع سے اس ملک کے باشندوں کے اموال کے

نہ لینے کا معاہدہ کیا ہے؟ پس غیر مسلم اقوام سے جو روپیہ ان ذرائع سے مسلمانوں کے قبضہ میں آئیگا، اس کے نہ لینے کی وجہ مسلمانوں کے لئے کیا ہو سکتی ہے؟ شریعت اسلامی ان اموال کو مسلمانوں کے لئے مباح کر چکی ہے، قانون بھی اس کے لینے کو جائز قرار دے رہا ہے، یعنی اس روپے کے لینے میں معاہدے کی خلاف ورزی بھی لازم نہیں آتی تو پھر مولانا کس بنیاد پر مسلمانوں کے لئے غیر مسلم اقوام سے حاصل کی ہوئی ان رقوم کے لینے اور اپنی ملک بنانے کو ناجائز ٹھہرا رہے ہیں،

استفسار و جواب

مفتاح الفلاح

"لفٹنٹ کرنل خواجہ عبدالرشید، آئی، ام، ای، ہتیفنہ میرٹھ کا علمی ذوق اردو کے علمی رسائل کے ناظرین سے مخفی نہین، حال مین ایک قلمی کتاب سے متعلق اپنے مراسلہ مین جو معلومات انھون نے دی ہین، وہ بعینہا درج ذیل ہین، (عبدالماجد)

جناب لفٹنٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب، میرٹھ } میری کتابون مین ایک قلمی نسخہ مفتاح الفلاح کا پڑا تھا کل مین اسکی پڑتال کر رہا تھا کہ خیال گذرا کہ اس کے متعلق آپ کو لکھ کر اس کی اہمیت دریافت کی جائے، کتاب عربی مین ہے، اور مین بدقسمتی سے اس زبان سے نابلد ہون، اور فائدہ نہین اٹھا سکتا، مندرجۂ ذیل خصوصیات اس سے متعلق آپ کو ارسال کرتا ہون، امید کہ آپ اپنا قیمتی وقت صرف کر کے مجھے مطلع فرمائین گے،"

تقطیع ۱/۲ × ۷ کاغذ عمدہ مگر قدرے خستہ، مجلد، جلد چرمی، نہایت خوشخط لکھی ہوئی ہے، اور دو سنہری حاشیے موجود ہین، کتاب سالم اور مکمل ہے اور جگہ جگہ حاشیے لکھے ہوئے ہین، جو کہ اصل کتاب کے متن سے بھی خوشخط ہین، اور غالباً مصنف کے ہاتھ ہی کے لکھے ہوئے ہین کتاب ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے جلد خوبصورت ہے مگر سادہ، کتاب کے شروع مین فہرست ابواب درج ہے، اور مصنف کا نام بھی موجود ہے، اس کے بعد ایک مستقل مقدمہ ہے، کتاب کا آخری جملہ یہ ہے،

"واسکنہ بحبوبۃ جنانہ فرغت من تالیف بعون اللہ تعالیٰ فی بلدۃ کنجہ مع تراکم افواج العلائق وتلاطم امواج العوائق وتوزع البال بالحل والترحال فی اوائل العشر الثالث من الشہر الثانی من السنۃ الخامسۃ من العشر الثانی بعد الالف وانا اقل الانام محمد المشتہر ببہاء الدین العاملی تجاوز اللہ عن سیاتہ والحمد للہ اولاً وآخراً وظاہراً وباطناً رب العالمین" سنہ [illegible]ھ

کتاب ختم یون ہوتی ہے:۔

"قد حصل الفراغ من القبال بعون الملک المتعال فی اواخر شہر رجب سنۃ الف ومائۃ وخمسین من الہجرۃ فی بلدۃ دارالسلطنت لاہور حرسہا اللہ تعالیٰ من الفتنۃ ووقع توفیق المقابلۃ وحصل سعادتہا مع نسخۃ قرأت عند الامام الرئیس اعنی المصنف رحمہ اللہ الدینار والمثقال واحدۃ"

اور آخر مین بزبان فارسی مندرجۂ ذیل عبارت ہے،

"ہر ہفت پانصد درہم شرعی است کہ بر سہ تومان ونیم است وزن مثقال شرعی یک محمدی نقرہ است"

کنجہ پنجاب مین ضلع گجرات کے قریب ایک قصبہ ہے، یہان سے قریب ہی ایک قدیم شاہراہ براستہ بھمبر کشمیر کو جاتی ہے، اور یہی شاہان مغلیہ کا راستہ تھا، یہان کے گرد و نواح مین متعدد مدرسے موجود تھے، میرا خیال ہے کہ شاید اسی مقام سے یہ مقام بھی مناسبت رکھتا ہے،

مین نے یہ کتاب سنہ [illegible] میں طہران مین خرید کی تھی، اس وقت محض اس کی خوشخطی مد نظر تھی جو کہ نہایت دلکش ہے،

معارف: مصنف مفتاح الفلاح بہاء الدین عاملی گیارہوین صدی ہجری کے مشہور اور جلیل القدر شیعی عالم ہین، ان کا پورا نام محمد بن حسین بن عبدالصمد الملقب بہ بہاء الدین ہے، ۹۵۳ھ مین قزوین (ایران) مین اور بعض روایتون کے مطابق بعلبک (شام) مین پیدا ہوئے، اور بچپن ہی مین اپنے والد کے ساتھ ایران مین منتقل ہوگئے، اور اُن سے اور اس عہد کے دوسرے اکابر علماء علامہ عبداللہ یزدی وغیرہ سے تحصیل علم کی، اور جملہ فنون مین یگانۂ روزگار ہوئے، کامل تیس سال تک درویشانہ لباس مین دنیائے اسلام کی سیاحت کی، اُن کا شہرۂ کمال سُن کر شاہ عباس صفوی نے اُن کو رئیس العلماء اور شیخ الاسلام کے منصب پر سرفراز کیا، وہ اُن کو اتنا مانتا تھا، کہ سفر و حضر کسی حالت مین جدا نہ کرتا تھا، اور تمام مہمات امور مین اُن سے مشورہ لیتا تھا، ۱۰۳۱ھ مین اصفہان مین وفات پائی، اور طوس مین دفن کئے گئے، مختلف فنون مین ان کی تصانیف مین بعض کے نام یہ ہین،

العروۃ الوثقی، صراط مستقیم، عین الحیاۃ، حبل المتین فی مزایا الفرقان المبین، اور مشرق الشمسین، تفسیر مین، شرح اربعین حدیث مین، جامع عباسی فارسی فقہ مین، مفتاح الفلاح، اور زبدۃ اصول مین، تہذیب نحو مین، اسرار البلاغہ معانی و بیان مین، رسالہ ہلالیہ، خلاصۃ الحساب، تشریح الافلاک، رسالۂ اصطرلاب ریاضی و ہیئت مین، المخلاۃ و کشکول، ادب و محاضرات وغیرہ مین، وسیلۃ الفوز والامان، مدح صاحب الزمان مین اُن کے علاوہ کشاف، بیضاوی، خلاصۃ الرجال اور درایۃ الحدیث وغیرہ مختلف کتابون پر حواشی لکھے اُن کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے ہین، اُن مین سے اسرار البلاغہ، تشریح الافلاک، خلاصۃ الحساب، کشکول، المخلاۃ اور وسیلۃ الفوز چھپ چکی ہین، مفتاح الفلاح اب تک قلمی اور نایاب ہے (خلاصۃ الاثر جلد ۳ ص ۴۴۰ تا ۴۵۵ اور روضات الجنات ص ۵۳۲ مین اُن کے تفصیلی حالات ہین) کتاب مفتاح الفلاح کے خاتمہ کی مصنف کی عبارت کے بعد ہند مین ۱۰۵۸ھ غلط ہے ۱۰۳۱ھ مین مصنف کی وفات ہو چکی تھی، غالباً کسی ناواقف نے عربی عبارت کا مطلب غلط سمجھ کر بعد مین ۱۰۵۸ھ بڑھا دیا ہے،

خاتمہ کی دوسری کاتب یا ناقل کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے، کہ مفتاح الفلاح کا یہ نسخہ اس نسخہ سے مقابلہ شدہ ہے جو خود مصنف سے پڑھا جا چکا تھا، اس لئے عام نسخون کے مقابلہ مین یہ نسخہ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس کے حواشی جیسا کہ کاتب کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، مصنف کے قلم کے نہین ہین،

گنجہ سے مراد گجرات کے قریب کا قصبہ نہین، بلکہ اران کا مشہور شہر یا نواح اصفہان و لرستان کا گنجہ مقصود ہے،

(م)

جزئی فضیلت کا مفہوم و مقصد

منشی عبدالرحمان خان صاحب
چلیک ملتان

مکرم:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اقبال نامہ مین حضرت مرحوم (ڈاکٹر اقبال مرحوم) کے جو خطوط آپ کے نام درج ہین، اُن کے مطالعہ سے طبیعت سیر نہ ہوئی، کیونکہ ایسے اہم تحقیقی خطوط کا بغیر جواب کے شائع کرنا قارئین کی پریشانی طبع کا سامان پیدا کرتا ہے، بہتر ہوتا کہ اُن کے جواب حاشیہ مین ہی دیئے جاتے، تاکہ پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا،

میرے خیال مین ہندوستان مین تمام بزرگون کے خطوط اسی نہج پر شائع ہوئے ہین، یا ہوتے ہین، الحمدُ للہ کہ اس باب مین بھی شرف اولیت حضرت مجدد الملت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب گرامی کو حاصل ہے، کہ تربیت السالک مین تمام اصلاحی خطوط مع حضرت والا کے جوابات کے شائع ہوئے، ایک عرصہ سے آپ کی بھی حضرت والا سے خط و کتابت رہی، بعض اور بزرگون سے بھی حضرت کی خاص خط و کتابت تھی، کیا ہی اچھا ہوتا، کہ اُن کے ایسے مکاتیب کا بھی ایک مجموعہ شائع کرنے کا انتظام ہو جاتا، اور اُن سے بھی ہزارون فیضیاب ہوتے، نہ معلوم آپ کی دماغ سوزی کا وہ تمام ذخیرہ اب علامہ اقبال کے پسماندگان کے

پاس محفوظ بھی ہے یا نہ، گو اس سلسلہ مین آپ سے کچھ عرض کرنا مناسب معلوم نہین ہوتا، مگر عرض کئے بغیر بھی نہین رہ سکتا، کہ ان خطوط کی اشاعت کا بھی ضرور کوئی انتظام ہونا چاہئے، یہ تشنگان علم پر ایک احسان ہوگا،

دوسری عرض یہ ہے کہ اقبالنامہ کے ص ۱۸۹ پر آپ نے "جزوی فضیلت" پر جو نوٹ تحریر فرمایا ہے، اس سے کم ازکم میری تشفی نہین ہوئی، بلکہ ایک خلش سی پیدا ہوتی ہے، اس لئے اگر کوئی امر مانع نہ ہو، تو ازراہ کرم اس کی تشریح فرماکر ممنون فرمادین، کہ وہ ایسی کون سی جزوی فضیلت ہے، جو کسی اور کو حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر حاصل ہوسکتی ہے؟ امید ہے کہ اس مسئلہ مین آپ میری رہنمائی و تسلی فرمادین گے،

معارف:- ڈاکٹر اقبال مرحوم کے نام میرے جوابی خطوط کی نقل میرے پاس نہین، اور نہ اب ان کے پس ماندون کے پاس میرے جوابات ہون گے، اور نہ اب مجھے پوری طرح یاد ہین، اس لئے اب ان کی تلافی کی کوئی صورت باقی نہین، اور نہ میری نگاہ مین اپنے جوابون کی وہ اہمیت ہے جو آپ نے ظاہر فرمائی ہے، اُدھر بزرگون کے پُر معرفت خطوط سے ان کو کیا مناسبت؟ البتہ آپ کو اگر ان مین کسی خط کا جواب مطلوب ہے تو مطلع فرمائین، کہ مین اپنی استطاعت کے مطابق اس کا جواب دوبارہ دیدون،

اقبال نامہ اس وقت میرے پاس نہین، اس لئے پوری بات میرے سامنے نہین ہے تاہم جہان تک آپ کے چند لفظون سے سمجھ سکا ہون جواب عرض کرتا ہون،

جزئی فضیلت کے معنی یہ ہین کہ مقام تفضیل مین کسی خاص ایسی بات مین کسی کو بڑائی دوسرے پر حاصل ہوجائے، جو دوسرے کو اجمالاً حاصل ہو، مثلاً حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام عربی زبان کے سوا کوئی دوسری زبان نہین جانتے تھے، اور آج زید عربی کے ساتھ دوسری متعدد زبانین جانتا ہے، تو یہ جزئی علمی فضیلت ہوئی، جو حضور علیہ السلام کے کمالات علمیہ کے لئے موجب نقص نہین، کیونکہ کسی زبان کے جاننے

کا جو حاصل ہے یعنی تفہیم و تذکیر و تبلیغ وہ آپ کو حاصل تھا، اسی طرح ہندوستان مین اسلام کی اشاعت کی جزئی فضیلت سلاطین اسلام کو حاصل ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین یہ واقعہ نہین ہوا، اس لئے یہ خاص فضیلت جزئی آپ کو حاصل نہین ہوئی، مگر چونکہ سلاطین اسلام کو یہ عملی فضیلت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبعیت مین بصورت اتباع اوامر جہاد حاصل ہوئی، اس لئے حضور کے کمالات علمیہ مین اس سے کوئی نقص واقع نہین ہوا، بلکہ افراد امت کے یہ جزئی فضائل بھی اس کے نبی کے کمالات عظمیٰ کی طرف راجع ہوجاتے ہین، جس طرح سپاہیون اور ماتحت افسرون کے کارنامے ان سپہ سالارون اور بادشاہون کے کارنامے شمار ہوتے ہین، جو فوجکشی کرتے ہین، جنگ کے نقشے بناتے ہین، اور جن کی تدبیر سے دشمن پر کامیابی ہوتی ہے،

"س"

مطبوعاتِ جدیدہ

مقاصد قرآن، از جناب مولوی صبغۃ اللہ صاحب بختیاری تقطیع اوسط ضخامت ۸۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ ر پتہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ چھچل گوڑہ حیدرآباد دکن،

مصنف کتاب عرصہ سے کلام مجید کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کی خدمت انجام دے رہے ہیں، یہ رسالہ بھی ایک مفید خدمت ہے، اس میں اُنھوں نے عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق کے متعلق کلام مجید کی بنیادی تعلیمات، ایمان باللہ، حشر و نشر، جزا و سزا، عمل صالح، نماز روزہ، حج و زکوٰۃ کی آیات نقل کرکے ان کی مفصل تشریح کی ہے اور ان کی حکمتیں اور مصلحتیں بیان کی ہیں جو ساری دنیا کی فلاح و سعادت کے لئے یکساں مفید ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب اپنے مقصد پر پوری طرح حاوی ہے، لیکن کتاب کے دیباچہ میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس کا مقصد جدید مفسرین کی اس غلط فہمی اور غلط استنباط کی تردید ہے، جو ان کو سورۂ بقرہ و مائدہ کی بعض آیات سے پیدا ہوتی ہے کہ یہود و نصاریٰ و صابئین کی نجات و ایمان کے لئے ایمان باللہ و بیوم الآخرہ اور عمل صالح کافی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور کلام مجید پر ان کے لئے ایمان لانا ضروری نہیں ہے، لیکن کتاب کے مباحث سے اس کی تردید نہیں ہوتی، مخالف یہ کہہ سکتا ہے کہ مصنف نے کلام مجید کی جو آیتیں اور تعلیمات نقل کی ہیں ان کا تعلق مسلمانوں سے ہے، یہود و نصاریٰ اس کے مکلف نہیں ہیں جیسا کہ سورۂ بقرہ اور مائدہ کی آیات سے ظاہر ہوتا ہے، اس کا مصنف نے کوئی جواب نہیں دیا ہے اور مرکز بحث یہی نقطہ ہے، حالانکہ خود کلام مجید کی کی دوسری آیات سے اس کا جواب مل جاتا ہے، اولاً کلام مجید

کی بعض آیات مجمل ہیں، اور ان کی تشریح کسی دوسری آیۃ سے ہوتی ہے، چنانچہ سورۂ بقرہ اور مائدہ کی ان آیات کی وضاحت جنھیں مخالفین دلیل میں پیش کرتے ہیں آل عمران کی آیات سے ہوتی ہے مثلاً قل للذین اوتوا الکتاب و الامیین ء اسلمتم فان اسلمتم فقد اھتدوا و ان تولوا فانما علیک البلاغ واللہ بصیر بالعباد یا ان الدین عند اللہ الاسلام وما اختلف الذین اوتوا الکتب الا من بعد ما جاءھم العلم بغیا بینھم ومن یکفر بآیات اللہ فان اللہ سریع الحساب ۰ ان میں یہود و نصاریٰ وغیرہ سے اسلام کا مطالبہ کیا گیا ہے اور اس سے انکار کو ضلالت نافرمانی اور کفر سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ ان کے تنہا ایمان باللہ و بیوم الآخرہ اور عمل صالح کافی نہیں ہے، معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اس اسلام سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا اسلام نہیں بلکہ مطلق اسلام ہے، جس کی دعوت تمام انبیا علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ پہلی آیۃ میں اہل کتاب کے ساتھ امیین یعنی عربوں سے بھی خطاب ہے اسلئے اس سے مراد مطلق دین اسلام نہیں ہو سکتا، دوسرے اگر مطلق دین اسلام بھی مان لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ اس دین پر بھی یہود و نصاریٰ میں سے کون قائم تھا، اس کو تو اُنھوں نے مسخ کر دیا تھا، دوسرے، سلام اور مطلق دین اسلام کی اساس گو ایک ہی ہے، لیکن ہر زمانہ کے حالات و ضروریات اور انسانوں کی ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ اس دین میں تغیرات ہوتے رہے اور مختلف زمانوں میں اس کا نصاب بدلتا رہا، اور اس کا آخری اور مکمل نصاب قرآن مجید ہے، اور اس پر ایمان کے بغیر مطلق دین اسلام کی بھی تکمیل نہیں ہوتی، اس کی مثال یہ ہے کہ انسان کی عمر اور اس کی ذہنی صلاحیت و ترقی کے لحاظ سے خود مروجہ رسمی تعلیم کا نصاب اور اس کے مدارج مختلف ہیں، اور ہر دور کے لئے جو نصاب مقرر ہے وہ اس کے اعتبار سے تو کافی، لیکن آیندہ دور کے لئے ناکافی ہے اور آخری دور کے نصاب کی تکمیل کے بغیر کوئی شخص پورا تعلیم یافتہ نہیں کہلایا جا سکتا، یا مثلاً آج سے چند صدی پیشتر جو نصاب تھا وہ اس زمانہ کے لحاظ سے بالکل مناسب اور کافی تھا، لیکن موجودہ حالات و ضروریات کیلئے نہ صرف ناکافی بلکہ ناقص ہے، اور آج اس نصاب پر قائم رہنے والا تعلیم یافتہ نہ کہلائے گا، یہی حال اسلام

کا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جس دین اسلام کو بھیجا تھا وہ اپنے زمانہ کے لئے بالکل مکمل تھا، لیکن بعد کے انبیاء حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں وہ حسب ضرورت بدلتا رہا، اور اس کی آخری اور تکمیلی شکل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین اسلام ہے، اس لئے اس پر ایمان کے بغیر مطلق اسلام پر بھی ایمان کامل نہیں ہوتا، اور یہود و نصاریٰ وغیرہ سب اس کے مکلف ہیں، اور اس پر ایمان کے بغیر ان کی نجات نہیں ہو سکتی،

رسالہ اخلاقیات، مؤلفہ ڈاکٹر میر ولی الدین استاذ جامعہ عثمانیہ تقطیع اوسط ضخامت ۱۲۳ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت تحریر نہیں، پتہ کتاب محل چار کمان حیدرآباد دکن،

تعلیم کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد انسانی اخلاق و سیرت کی تعمیر ہے، اس لئے اصولاً سب سے زیادہ توجہ اسی پر ہونی چاہئے، لیکن موجودہ نظام تعلیم میں عملاً اس کی کوئی اہمیت نہیں، حیدرآباد کے شعبۂ تعلیم نے دوسری تعلیمی اصلاحات کی طرح اس اصلاح کی جانب بھی سبقت کی ہے، اور میٹرک کے نصاب کے لئے اخلاق پر یہ رسالہ مرتب کرایا ہے، اس کے فاضل مؤلف فلسفہ مذہب و اخلاق کے عالم بھی ہیں اور اس پر عامل بھی، تعمیر اخلاق و سیرت انکا خاص موضوع ہے، اس لئے اس کام کے لئے اس سے زیادہ موزوں انتخاب نہیں ہو سکتا تھا، جس پر رسالہ کے مباحث شاہد ہیں، اس میں انھوں نے ان تمام بنیادی اخلاق کو جو ایک متوازن اور اعلیٰ سیرت کی تعمیر اور انسان کو انسان بنانے کے لئے ضروری ہیں علمی طرز سے مرتب کیا ہے، اس میں حسب ذیل ابواب ہیں، صبر و استقلال، مصلحت بینی و دور اندیشی، اوقات فرصت کا صحیح استعمال، اعتدال و پرہیزگاری، عفت و پاکبازی، رواداری، عدالت، اصلاح معاشری، اخوت، پیشے کا انتخاب، ان تمام ابواب کے تحت میں بہت سے تفصیلی و ذیلی مباحث ہیں، یہ وہ اصولی اخلاق ہیں جو بلا اختلاف تمام مذاہب اور قوموں میں مشترک ہیں، اس لئے یہ کتاب ہر مذہب و ملت کے طلبہ کے لئے یکساں مفید اور اس لائق ہے کہ ہندوستان کی تمام درسگاہوں کے نصاب میں اسکو داخل کیا جائے،

سماج کا ارتقا، مولفہ جناب حکیم اللہ صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۲۸۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ سنگم پبلشرز لمیٹڈ لاہور،

ڈارون کے نظریہ کے مطابق ارتقا کا عمل دنیا کی ہر چیز میں جاری ہے، چنانچہ انسانی معاشرہ بھی مختلف طبعی و جغرافی اور سیاسی و معاشی عوامل کے ماتحت مختلف قالب بدلتے اور ترقی کرتے ہوئے موجودہ منزل تک پہنچا ہے، اس کتاب میں اس معاشری ارتقار کی سرگذشت بیان کی گئی ہے، اور انسان کے دور وحشت و بربریت کے زمانہ سے لیکر موجودہ عہد تک ہر دور کے عمرانی و تمدنی و معاشی و سیاسی نظاموں اور مختلف عوامل کے ماتحت ان کے تغیرات اور عہد بعہد کی ترقیوں کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے، جس سے انسانی معاشرہ کے تمام مدارج اور اس کے ارتقار کی پوری سرگذشت سامنے آجاتی ہے، لیکن یہ کتاب جدید فنی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس حیثیت سے مفید معلومات پر مشتمل ہے، اگر مذہبی نقطۂ نظر سے اس کے تمام بیانات سے اتفاق ضروری نہیں ہے،

معین الفرائض از جناب مفتی محمود حسن صاحب مدرس اول جامع حسینیہ راندیر (سورت) تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۳ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتے، مذکورہ پتہ پر مصنف اور منیجر کتب خانہ تعلیمی نور گنج، دہلی سے ملے گی،

علم الفرائض یعنی تقسیم وراثت ایسا فن ہے جس کی ضرورت صرف علماء اور عربی خوانوں تک محدود نہیں بلکہ وکلار، عدالتوں، یونیورسٹی کے قانون کے طلبہ کو بھی اس کی ضرورت پڑتی ہے، اس لئے مصنف نے فرائض کے تمام ضروری مسائل کو اس کتاب میں اردو میں مرتب کر دیا ہے، انداز بیان اتنا سلجھا ہوا ہے کہ ہر پڑھا لکھا شخص آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے، مسائل میں اختصار کے ساتھ پوری جامعیت ہے، اور اس سے ہر طبقہ کے ضرورت مند اشخاص فائدہ اٹھا سکتے ہیں،

حدیث نبوی کے اولین صحیفے، از مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی، تقطیع چھوٹی.

ضخامت ۳۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، پتہ ادارہ تعلیمات اسلام نمبر ۳ امین آباد پارک لکھنؤ۔

منکرین حدیث کی جانب سے حدیثوں کی بے اعتباری کے ثبوت میں جو غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ موجودہ کتب حدیث عہد رسالت کے بہت بعد میں مرتب ہوئیں، اس لئے لائق اعتماد نہیں، اور چونکہ عام لوگوں کی نظر حدیث کی تاریخ پر نہیں ہے، اس لیے ان کو اس کے یقین کرنے میں تامل نہیں ہوتا، یہ بلاشبہہ صحیح ہے کہ حدیث کی موجودہ کتابوں کی تدوین کا آغاز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ڈیڑھ دو صدی بعد سے ہوا، لیکن حدیثوں کی کتابت عہد نبوی ہی سے شروع ہوگئی تھی، اور بہت سے صحابہ حدیثیں قلمبند کرتے تھے، پھر ان کے تلامذہ نے بھی اس کو جاری رکھا، اور اسی زمانہ میں حدیثوں کے بہت سے مجموعے مرتب ہوگئے تھے، جو اگرچہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ گئے، لیکن حدیث و رجال کی کتابوں میں انکا ذکر موجود ہے، اور انکی حدیثیں موجودہ کتب حدیث میں شامل ہوگئیں، لائق مؤلف نے اس رسالہ میں ایسے اٹھارہ حفاظ حدیث صحابہ کے مجموعہ احادیث کا ذکر کیا ہے جو خود حدیثیں قلمبند کرتے تھے یا ان کے تلامذہ نے ان کے علم و اجازت سے ان کی مرویات تحریر کیں، ان صحابہ کی مرویات کی تعداد بھی مصنف نے لکھدی ہے، جس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ہزاروں حدیثیں عہد نبوی اور عہد صحابہ میں قلمبند ہوگئی تھیں، یہ رسالہ گو مختصر ہے، مگر بہت مفید ہے،

مختصر سیر الصحابہ، شائع کردہ ادارہ تعلیمات اسلام قیمت ۱۲ ار، مذکورہ بالا پتہ سے ملے گی،

ادارہ تعلیمات اسلام جو عرصہ سے قرآن مجید کے درس و تعلیم کی مفید خدمت انجام دے رہا ہے، اب اس نے بچوں کیلئے مختصر سیر الصحابہ کی تالیف و اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے اور فی الحال حضرت بلال رضی، حضرت ابوہریرہ رضی اور حضرت عبداللہ بن عمر رضوان اللہ علیہم کے سبق آموز حالات آسان زبان میں شائع کئے ہیں، جنکے مؤلف علی الترتیب مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی، احتشام علی صاحب رحیم آبادی اور مولوی شبیر الحق بحر آبادی ہیں یہ سب کتابیں بچوں کے پڑھانے کے قابل ہیں، ان سے ان کو مذہبی و اخلاقی سبق بھی حاصل ہوتا ہے اور تاریخ اسلام سے بھی واقفیت ہوجاتی ہے،

"م"

اور تاریخی کتابین

تاریخ اخلاق اسلام، جلد اول، اس مین اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتون سے نقد و تبصرہ ہے،

مصنفہ: مولانا عبدالسلام ندوی ضخامت ۴۰۶ صفحے، قیمت: ۴ع

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہین، ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابون مین مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانون کے تعلیمی نظام اور ان کے مدرسوں اور تعلیم گاہون کا حال معلوم کرنا چاہین تو نہین مل سکتا، مولوی ابوالحسنات مرحوم نے نہایت تلاش و تحقیق سے ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہون پر معارف مین ایک مقالہ لکھا تھا جس کو اہل نظر نے بے حد پسند کیا، اب دار المصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت مین نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے،

ضخامت ۱۳۴ صفحے، قیمت: ۱۲ ار

مختصر تاریخ ہند، مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علمون کے لئے اس غرض سے لکھی ہے کہ ہندو اور مسلمان فرمانرواؤن نے ہندوستان کے بنانے مین جو کام کئے ہین، اور جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہین وہ طالب علمون کو بلاتفریق مذہب و ملت معلوم ہوجائین،

اس کتاب کو گورنمنٹ بہار نے اپنے سرکاری مدرسون مین بھی جاری کر دیا ہے، اور حکومت یوپی نے اس کے ۵۰۰ نسخے سرکاری لائبریریون کے لئے خریدے ہین، ضخامت: ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ

ہماری بادشاہی، ہمارے چھوٹون بچون کے نصاب مین کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو ان کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کرسکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتون کی مختصر اور آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیون مین مسلمانون نے دنیا کے مختلف حصون مین قائم کین،

ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ

ہندوستان کی کہانی، ہندوستان کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا رسالہ نہایت آسان اور سہل زبان مین لکھا گیا ہے تاکہ مکتبون اور ابتدائی مدرسون کے بچے اس کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکین، اور ان کو معلوم ہوجائے کہ وہ کون تھے اور اب کیا ہین، ضخامت ۴ہ صفحے قیمت ۴ر

مرتبہ: مولوی عبدالسلام قدوائی ندوی

مقدمہ رقعات عالمگیر، اس مین اسلامی فن انشا اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغہ انشا کی تفصیل ہے، اور پھر عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر، خود عالمگیر کے خطوط و رقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی گئی ہے،

۳۹۷ صفحے، قیمت: للعہ

رقعات عالمگیر، اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہین، اس جلد مین جمع کئے گئے ہین، ان سے ادب، سیاست، اور تاریخ کے بیسیون حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی ایم اے

ضخامت: ۴۸۷ صفحے،

قیمت: سے ر